دورة بصائر الهداية لتأهيل الدعاة

المستوى الثاني

مادة

أصول التفسير

جمع وترتيب

الدكتور/ محبوب أحمد أبوعاصم

وزارة الشؤون الإسلامية بمملكة البحرين

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

الحمد لله ربِّ العالمين, والصلاة والسلام على إمام المتَّقين، وخاتم النَّبيّين؛ سيّدنا محمد وعلى آله وصحابته الغرِّ الميامين، ومن اقتفى أثره واستنَّ بسُنَّته إلى يوم الدِّين، أمَّا بعد:

اللہ تعالی نے قرآن کریم کو انسان کی ہدایت اور دنیاوآخرت کی سعادت کے لیے نازل فرمایا ہے: ﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ . وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ﴾ "جب میری طرف سے تمھیں کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اُس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا نہ بد بختی میں مبتلا ہوگا- اور جو میرے "ذِکر" (وحی) سے منہ موڑے گا اُس کے لیے دنیا میں تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے " (طه: 123-124)

قرآن کریم دنیا کی واحد کتاب ہے جس کے معانی ومطالب محض لغت سے حل نہیں ہو سکتے، اور نہ محض زبان دانی اس کے مفاہیم کو آسان کر سکتی ہے، اسی لیے اس کتابِ ہدایت کی تعلیمات واضح کرنے کے لیے اللہ تعالی سید الکونین کو مبعوث فرمایا جس نے علمی اور عملی ہر لحاظ سے اس کے مطالب کو بیان کیا: ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ "ہم نے یہ ذکر (قرآن) تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس کی تشریح وتوضیح کرتے جاؤ جو اُن کے لیے اتاری گئی ہے، اور تاکہ لوگ (خود بھی) غور وفکر کریں﴾ (النحل: 44)، چنانچہ رسول کریم ﷺ اس قرآن کے سب سے پہلے معلم ومفسر ہیں، جن سے صحابہ کرام نے فیض حاصل کیا، اور ان سے تابعین اور تبع تابعین اور پھر ان سے بقیہ امت کو یہ سرمایا منتقل ہوا.

علم اصولِ تفسیر کے ابتدائی مراحل:

قرآن کریم ہی دنیا کی واحد کتاب ہے جس کی تشریح وتوضیح کے لیے باقاعدہ اصول وضوابط مرتب ہوئے، جن اصولوں کی بنیاد رسول کریم ﷺ نے رکھی، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (جب یہ آیت نازل ہوئی :﴿ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ شَقَّ ذَلِكَ عَلَى أَصْحَابِ رَسُولِ اللّهِ ﷺ وَقَالُوا: أَيُّنَا لاَ يَظْلِمُ نَفْسَهُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللّهِ صلى الله عليه وسلم: «لَيْسَ هُوَ كَمَا تَظُنُّونَ، إِنَّمَا هُوَ كَمَا قَالَ لُقْمَانُ لابْنِهِ :﴿ يَا بُنَيَّ لاَ تُشْرِكْ بِالله إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾) (وہ لوگ جو ایمان لائے اور پھر اپنے ایمان میں کسی ظلم کی امیزش نہ کی) تو اصحاب رسول ﷺ پر بہت گراں گذری، اور انہوں نے کہا: ہم میں سے کون ہے جو اپنی جان پر ظلم نہ کرتا ہو؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ نہیں جو تم خیال کرتے ہو، یہ تو لقمان علیہ السلام کا اپنے بیٹے کو نصیحت کرنا ہے: ﴿ يَا بُنَيَّ لاَ تُشْرِكْ بِالله إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾(بیٹا! اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، کیونکہ شرک ہی سب سے بڑا ظلم ہے) (متفق عليه). اس حدیث میں نہ کہ رسول اللہ ﷺ نے ظلم کا معنی بیان کیا، بلکہ تفسیرِ قرآن کا اصول بیان کیا کہ مشکل پیش آنے میں ہم کس طرح قرآن کے معانی تک پہنچ سکتے ہیں، اور وہ یہ کہ قرآنِ کریم میں سب سے بڑا ظلم شرک کو قرار دیا گیا ہے، چنانچہ مذکورہ آیت میں یہی ظلم مراد ہے، ورنہ کوئی ایسا شخص نہیں جو ہر طرح کے ظلم سے بچ سکتا ہو.

اسی طرح بعض اوقات کسی صحابی کو جب خطابِ ربانی کے جاننے میں غلط فہمی ہوتی تو نبی کریم ﷺ اس کی تصحیح فرماتے، جیسا کہ عدی بن حاتم کا واقعہ ہے: ﴿حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ (یہاں تک کہ تمہارے لیے سفید دھاری سیاہ دھاری سے واضح ہو جائے)، عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے سفید اور سیاہ دھاری کا ظاہری معنی لیتے ہوئے اپنے تکیہ کے نیچے سفید او سیاہ رسیاں رکھ لیں، اور کھانا کھاتے رہے، یہاں تک کہ دن کی روشنی سے وہ دونوں رسیاں صاف نظر آنے لگیں، تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ اس سے مراد رات کا اندھیرا اور صبح کی روشنی ہے) (متفق عليه)

امام مجاہد رحمہ اللہ (الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ) میں (يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: (يَتّبِعونَه حقَّ اتّبَاعِه) تو انہوں نے تلاوت کا معنی اتباع سے کیا، کیونکہ اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا . وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَاهَا﴾ يتلو بمعنى يتبع، چنانچہ اصولِ تفسیر کا علم تفسیرِ قرآن کے ساتھ ہی معرض وجود میں آیا.

اصول تفسیر میں چند اہم مؤلفات:

مقدمه في أصول التفسير ، لشيخ الإسلام ابن تيمية

مناهل العرفان في علوم القرآن لمحمد عبدالعظيم الزرقاني

الإتقان في علوم القرآن لجلال الدين السيوطي

الفوز الكبير في أصول التفسير لشاه ولي الله الدهلوي

القواعد الحسان المتعلقه بتفسير القرآن للشيخ عبدالرحمن السعدي

أصول في التفسير للشيخ محمد بن صالح العثيمين

علم اصول تفسیر کی اہمیت وفضیلت:

کسی علم کی فضیلت واہمیت اس کے موضوع کی اہمیت کے لحاظ سے ہوتی ہے، اور جب علم اصولِ تفسیر کا تعلق کائنات کے سب سے افضل کلام: کلامِ رب العالمین کی صحیح منہج کے مطابق فہم وتدبّر سے ہے، تو اسی سے اس علم کی فضیلت واہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے.

مزید یہ کہ اصولِ تفسیر کی اہمیت کا اندازہ علمِ تفسیر کی اہمیت سے معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اصولِ تفسیر کے علم کی حیثیت تفسیر کے لیے اسی طرح ہے جس طرح علمِ حدیث کی حیثیت حدیث کے لیے ہے، اور علمِ نحو کی حیثیت عربی لغت کے لیے ہے.

شيخنا ابن عثيمين رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کسی شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر علم کے اصول و قواعد سیکھے، جس سے اسے اس علم کی معرفت اور ان اصولوں پر اس کی تخریج میں مدد ملتی ہے، تاکہ اس کا علم مضبوط بنیادوں پر مبنی ہو، کسی نے خوب کہا ہے: (مَنْ حُرِم الاَصول، حُرِم الوُصول) جو اصول سے محروم رہا وہ کوئی چیز پانے سے بھی محروم ہوگیا.

مزید فرماتے ہیں: تمام علوم میں سے سب سے جلیل القدر علمِ تفسیر ہے، جس سے اللہ تعالی کے کلام کا بیان اور وضاحت ہوتی ہے.

اصول تفسیر کے علم کے فوائد:

1. علم تفسیر کی ابتداء وترقی کا علم ہونا، اور علماء امت کی اس موضوع پر صَرف کی ہوئی کوششوں اور محنتوں کا اندازہ ہونا.
2. قرآن کریم کے عظیم اور وسیع معانی ومقاصد کا علم، اور اس کی حکمتوں اور اسرار کی معرفت ہونا.

3. قرآن کریم کی تفسیر کا صحیح منہج اور طریقہ معلوم کرنا، تاکہ اللہ کی کتاب کے فہم و تفہیم میں کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں.
4. ان قواعد وضوابط کی معرفت ہونا جن سے اللہ کی کتاب کی سمجھ بوجھ میں آسانی ہو.
5. مفسرین کی فکری اور عقائدی توجہات کی معرفت حاصل کرنا، اور یہ کہ مختلف مکاتب فکر کی تفسیرِ قرآن پر کیا تاثیر رہی ہے.
6. ان علوم سے قرآن کریم کی تفسیر میں کی جانے والی تحریفات اور غلط انداز کی پہچان ہونا. اور پھر ان غلط تفسیروں کی نشاندہی کرنا.
7. تفسیر قرآن سے متعلقہ دشمنان اسلام کے پیدا کردہ شبہات کا ردّ کیا جانا.

اصولِ تفسیر القرآن

اصل کے معانی:

کسی چیز کی بنیاد اور اس کے نچلے حصہ کو اصل کہا جاتا ہے، اصل کی جمع اصول ہے، طئے شدہ ضابطے بھی کو اصل کہا جاتا ہے.
اسی طرح اہلِ لغت نے اور بھی کئی معانی بیان کیے ہیں، اور یہاں پر مذکورہ دونوں معنی مراد ہے.
علمی اصطلاح میں اصل اس قاعدہ کو کہتے ہیں جس پر دوسرے علمی مسائل کی بنیاد رکھی جاتی ہو.

تفسیرِ قرآن کا معنی ومفہوم:

تفسیر کا لفظ "فسر" سے مشتق ہے، جس کے معنی کھولنے، حجاب اٹھا دینے، اور واضح کر دینے کا ہے؛ چونکہ اس کے ذریعہ قرآن کے معانی ومفاہیم کھول کر بیان کئے جاتے ہیں، اس لیے اس کو علمِ تفسیر سے تعبیر کیا جاتا ہے، قرآن مجید میں اس کے لیے دوسرے الفاظ بھی آتے ہیں، تفسیر، تأویل، بیان، تبیان، تبیین، جو تقریباً ہم معنی ہیں-

چنانچہ تفسیر کا معنی: کسی مشکل لفظ کا معنی ومراد بیان کرنا ہے. جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تفسيرا﴾ (اور یہ کافر لوگ آپ کو کوئی بھی اعتراض نہیں دیتے مگر ہم اس کے مقابلہ میں حق اور بہتر تفسیر لاتے ہیں) (الفرقان: 33)، اسی طرح حدیث نبوی میں ہے: ((كانَ أهْلُ الكِتَابِ يَقْرَؤُونَ التَّوْرَاةَ بالعِبْرَانِيَّةِ، ويُفَسِّرُونَهَا بالعَرَبِيَّةِ لأهْلِ الإسْلَامِ، فَقالَ رَسولُ اللَّهِ صلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ: لا تُصَدِّقُوا أهْلَ الكِتَابِ ولا تُكَذِّبُوهُمْ:..)) (اہل کتاب تورات عبرانی میں پڑھتے اور مسلمانوں کے لیے اس کی تشریح عربی میں پیش کرتے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو..) (البخاري : 7361)، اسی طرح عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (إنَّ آخِرَ القرآنِ كان تَنزيلًا آيةُ الرِّبا ، ثم تُوُفِّيَ رسولُ اللهِ ﷺ قبلَ أن يُفَسِّرَها لنا ، فدَعوا الرِّبا والرِّيبَةَ) (آیت ربا قرآن میں سب سے آخر میں نازل ہوئی، رسول اللہ ﷺ وفات پاگئے اس سے پہلے آپ اس کی تشریح کریں، لہٰذا تم سود اور شک چھوڑ دو) (صحيح ابن ماجه:1860).

تفسیر کا اصطلاحی مفہوم:

اگرچہ تفسیر کا اطلاق ہر قسم کی وضاحت وبیان پر ہوتا ہے، لیکن اہل علم کی اصطلاح میں یہ لفظ خصوصاً قرآن کریم کی تشریح وتفہیم کے لیے استعمال کیا گیا ہے، حتی کہ حدیث کی تشریح کو بھی تفسیر نہیں کہا جاتا، بلکہ شرح الحدیث کہا جاتا ہے. اسی لیے قرآن کی وضاحت کرنے والے کو مفسر، اور حدیث نبویہ کی وضاحت کرنے والے کو شارح حدیث کہا جاتا ہے.

علامہ زرکشی فرماتے ہیں:

عِلمٌ يُرَادُ به فَهْمُ كتاب اللّه تعالى المنزَّلِ على نَبِيِّه محمدٍ ﷺ وبيانُ مَعَانِيه واسْتِخْرَاجُ أحكامِه وَحِكَمِهِ: تفسیر وہ علم ہے جس سے اللہ کی اس کتاب کی معرفت حاصل کی جاتی ہے جو محمد ﷺ پر نازل ہوئی، نیز اس علم کے ذریعہ کتاب کے معانی ومفاہیم کی تشریح کی جاتی ہے، اور اس کے احکام ومسائل اور حکمتیں اخذ کی جاتی ہیں.

چنانچہ علمِ تفسیر میں چار خصوصیات پائی جاتی ہیں:

1- قرآن کریم کا عمومی فہم حاصل کرنا.
2- قرآن کریم کے معانی ومفہوم کی تشریح کرنا.

3- قرآن سے احکام و مسائل اخذ کرنا.
4- معانی قرآن کے حکمتیں اور مصلحتیں واضح کرنا.

تأویل اور تفسیر:

قرآنی آیات کی تشریح وتوضیح کے لیے تفسیر کے علاوہ تأویل کا لفظ بھی بکثرت استعمال کیا گیا ہے. حتی کہ **ابن جرير طبري** نے اپنی تفسیر کا نام ہی: "جَامِعُ البَيانِ عَنْ تَأوِيلِ آيِ القُرْآن" رکھا ہے، اور آیات کی تفسیر میں بھی انہوں نے بکثرت اس لفظ کا استعمال کیا ہے، عموماً لکھتے ہیں: تَأوِيلُ قَولِهِ عَزَوَجَل..."، اسی طرح **ابن قتيبه** رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کا نام: تَأوِيلُ مُشكلِ القرآن رکھا ہے. بعض دیگر مفسرین نے بھی یہی لفظ استعمال کیا ہے.

ابن الأعرابي فرماتے ہیں: تفسیر اور تأویل ایک ہی معنی میں ہے، لفظِ تأویل بھی قرآن وحدیث میں وارد ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالی ہے: (وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ) ابن کثیر فرماتے ہیں: "اس مقام پر تأویل سے حقیقی تفسیر مراد ہے، یعنی متشابہ آیات کا حقیقی معنی اللہ تعالی کے سوا کوئی نہیں جانتا. اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں نبی کریم ﷺ کا خواب جس میں آپ کو دودھ کا پیالہ پیش کیا گیا، آپ سے پوچھا گیا: (فَما أَوَّلْتَهُ يا رَسولَ اللَّهِ؟ قالَ :العِلْمَ) تو آپ نے اس کی کیا تعبیر کی؟ آپ نے فرمایا: علم کی) (البخاري). جہاں تأویل کو تعبیر کا معنی دیا گیا ہے.

قرآن کا معنی ومفہوم:

قرآن: قَرَأَ يَقْرَأُ کا مصدر ہے جس کا معنی: تَلا يَتْلُو، اور جَمَعَ يَجْمَعُ، چنانچہ قرآن کا معنی: بہت پڑھا جانے والا، اور جمع کرنے والا ہے، کیونکہ کائنات میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اللہ تعالی کی یہ کتاب ہے، اور اس میں احکام وواقعات جمع کیے گئے ہیں، اور اسے مصاحف اور سینوں میں جمع کیا جاتا ہے. ابو عبید فرماتے ہیں: أُطْلِقَ اِسْمُ الْقُرآنِ عَلَى كِتابِ اللهِ ؛ لِأَنَّهُ يُؤَلِّفُ بَينَ السُّوَرِ، وَيَضُمُّ بَعْضَها إِلَى بَعْض ، وَمِنْهُ قَوْلُهُ تَعَالى: ﴿إِنَّ عَلَينَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَه﴾ یعنی ایک دوسرے کے ساتھ جمع کرنا. اللہ کی کتاب کو قرآن کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ واقعات، اخبار، وعدوعید اور اوامر ونواہی پر مشتمل ہے.

جبكه اصطلاحي طور پر قرآن سے مراد: اللہ تعالی کا وہ کلام ہے، جو نبی کریم محمد ﷺ پر نازل ہوا، جو اپنے الفاظ میں اعجاز ہے، اور اس کی تلاوت عبادت ہے، سورۃ الفاتحہ سے شروع ہو کر سورۃ الناس پر ختم ہوتا ہے، جسے تواتر سے ہم تک نقل کیا گیا ہے.

قرآن کریم میں قرآن کے پانچ نام استعمال ہوئے ہیں: (1) القرآن. (2) الفرقان. (3) الذکر. (4) الکتاب. (5) التنزیل.

جبکہ لفظ قرآن (61) مرتبہ دہرایا گیا ہے.

قرآن کریم میں قرآن کے بعض اوصاف:

رشد وہدایت کی کتاب: ﴿ذلِكَ الْكِتابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدىً لِلْمُتَّقِينَ﴾ ﴿إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا﴾

کتابِ عظیم: ﴿وَلَقَد آتَيناكَ سَبعًا مِنَ المَثاني وَالقُرآنَ العَظيمَ﴾ ﴿ق وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ﴾

بابرکت کتاب: ﴿وَهَذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾

بشارت کی کتاب : ﴿إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا﴾

ڈرانے والی کتاب : ﴿ وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنُ لأُنْذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ ﴾

ہر چیز کو کھولنے والی اور باعث رحمت: ﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴾

سابقہ آسمانی کتابوں پر حاوی: ﴿ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ ﴾

مصدرِ شریعت اللہ : ﴿ تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ﴾

گمراہیوں سے نکال کر ہدایت کی روشنیوں کی رہنمائی کرنے والی: ﴿كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ صِرَاطِ﴾

سابقہ آسمانی کتابوں کے مقابلے میں قرآن کی خصوصیات :

1. اللہ تعالی نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی، چنانچہ یہ ہر تحریف و تغییر سے محفوظ ہے
2. جسے سندِ تواتر کا شرف حاصل ہے.
3. جس کی تلاوت عبادت ہے، اور ایک حرف کی دس نیکیاں ہیں.
4. جس کی تلاوت غور و فکر سے سننا ضروری قرار دی گئی ہے.
5. جس کی تلاوت ہر وقت دنیا میں جاری ہے.
6. جسے نازل کیے جانے والے رسول ﷺ کی زندگی میں ہی لکھ دیا گیا.
7. جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی.
8. جس کی تعلیمات فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہیں
9. جو ہر طرح کے تناقضات اور تضاد سے محفوظ ہے.
10. جو کائنات کا سب سے بڑا معجزہ ہے.
11. جس کا حفظ وتدبر آسان کر دیا گیا ہے.
12. جو دنیا میں سب سے زیادہ تلاوت کی جاتی ہے.
13. جس کے پڑھنے سننے والوں پر سکینت نازل ہوتی ہے.
14. جو سابقہ آسمانی کتابوں پر حاوی وحاکم ہے.
15. جسے سیکھنے سکھانے والا افضل ترین شخص ہے
16. جو سب سے زیادہ بندوں کے سینوں میں محفوظ ہے
17. جو بہت سے نئے علوم کی إیجاد کا سبب ہے.
18. جس کی وجہ اس کی زبان (عربی) بھی محفوظ ہو گئ.
19. جو اپنی فصاحت و بلاغت سے بذاتِ خود ایک معجزہ ہے.
20. جو ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لیے رشدُ وہدایت کا ذریعہ ہے

قرآن اور حدیثِ قدسی میں فرق:

حدیثِ قدسی کی تعریف: هُوَ مَا نُقِلَ إِلَيْنَا عَنِ النَّبِي ﷺ مَعْ إسنادِهِ إيَّاهُ إِلَى رَبِّهَ عَزَّوجل : وہ حدیث جو نبی کریم ﷺ کے واسطہ سے ہم تک پہنچے، اور آپ اسے اللہ کی منسوب کریں۔ (تيسير مصطلح الحديث)

1. قرآن کے الفاظ و معانی اللہ کی طرف سے ہیں، جبکہ حدیثِ قدسی کے معانی اللہ کی طرف سے اور الفاظ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے ہیں۔
2. قرآن سندِ تواتر سے ثابت ہے، چنانچہ وہ قطعی الثبوت ہے، جبکہ حدیثِ قدسی تواتر سے ثابت نہیں، لہذا یہ قطعی الثبوت نہیں۔
3. قرآن کی نماز میں تلاوت کی جاتی ہے، جبکہ حدیث قدسی نماز میں نہیں پڑھی جاتی۔
4. قرآن کے ایک حرف پڑھنے کی دس نیکیاں ہیں، جبکہ حدیث قدسی پڑھنے کا یہ اجر نہیں۔
5. قرآن ایک علمی وادبی معجزہ ہے، جبکہ حدیث قدسی میں یہ اعجاز نہیں ہے۔
6. قرآن جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ نازل ہوا، جبکہ حدیث قدسی کی یہ شرط نہیں، بلکہ یہ الہام وغیرہ سے بھی ہو سکتی ہے۔
7. قرآن کے ایک حرف کا انکار کرنا بھی کفر ہے، جبکہ حدیث قدسی کی سند اگر نا قابل اعتبار ہو تو اس کا انکار کرنا کفر نہیں ہے۔
8. قرآن کی معنی سے تلاوت کرنا جائز نہیں، جبکہ حدیث قدسی معنی سے روایت کی جا سکتی ہے۔

علمِ تفسیر کی ضرورت:

قرآن میں اس کے نازل کرنے والے کی مراد سمجھنے کے لیے پیغمبرانہ رہنمائی اور تعلیم کی اشد ضرورت تھی، قرآنی آیات کے شانِ نزول کو بیان کرنے، احکامات کی وضاحت، اور عملی شکلوں کو متعین کرنے، عبادات کے طریقہ اور ترکیب کو واضح کرنے اور شرعی امور کی تفصیلات فراہم کرنے کے لیے ضروری تھا کہ قرآن کریم کی اجمالی تعلیمات کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے، اسی ضرورت نے فنّ تفسیر کو جنم دیا۔

مَناهِجُ المُفَسِّرِين:

قرآن کی تفسیر کے لیے مفسرین کے دو بنیادی منہج رہے ہیں:

(1) مَنْهَجُ التَّفْسِيرِبألماثور.   (2) مَنْهَجُ التَّفْسِيرِبالرأي.

منہج التفسیر بألماثور:

تفسیرِ بألماثور کا لغوی معنی:

عربی میں نشان کو اثر کہتے ہیں، اور اسلاف سے منقول شدہ حکم کو أَثَرَة الْعِلْم اور أثَارَة الْعِلْم کہتے ہیں، اسی سے لفظ مأثور بطور اسم مفعول مشتق ہے، چنانچہ لغوی مفہوم کے لحاظ سے تفسیر بألماثور وہی تفسیر ہے جو سلف صالحین سے منقول اور متوارث ہو۔

صحیح قول کے مطابق تفسیرِ بألماثور سے مراد: نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام اور تابعین سے باسند روایت شدہ تفسیر ہے۔

تفسیر بألماثور کی امتیازی حیثیت:

قرآن کریم کی تفسیر کرتے ہوئے وحی کی طرف رجوع کرنا، اور قرآن سے رہنمائی لینا ضروری ہے، لیکن رہنمائی لینے کا انداز کیا ہو؟ اس مقصد کے لیے کس چیز کو قرآن نے معیار قرار دیا جائے؟

اس کا جواب قرآنِ کریم میں کچھ اس طرح سے دیا گیا ہے: ﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ ما آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا﴾ (اگر وہ (امت کے لوگ) اسی طرح کا ایمان لاتے ہیں جس طرح کا (اۓ صحابہ) تم ایمان لائے ہو تو یقیناً ہدایت یافتہ ہو گئے)، اللہ تعالی نے صحابہ کرام کو ایمان اور علم و عمل میں نمونہ قرار دیا ہے، سیدنا ابن مسعود فرماتے ہیں: "**عَلَيكُمْ بِالأَمْرِ العَتِيْق**" قرون اولی کے اسلام پر ہی عمل پیرا رہو. چنانچہ تفسیر بالماثور کا یہی انداز ہے، کہ جب تک سلف صالحین کی سند نہ ہو اس وقت تک اس کا کوئی اعتبار ہی نہیں، یہی انداز ہمیں تفسیر طبری، ابن کثیر، اَضواء البیان، ابن سعدی، احسن البیان اور تفسیر القرآن الکریم جیسی تفسیروں میں نظر آتا ہے، ان میں صدیوں کے فاصلے ہونے کے باوجود ایک خاص تسلسل پایا جاتا ہے، جن کے فہم کی بنیاد قرآن وسنت اور آثارِ صحابہ ہے.

تفسیر بالماثور کی خصوصیات:

1. تفسیر بالماثور صحابہ کرام، تابعین جیسے سلف صالحین کا منہج ہے، ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ﴿وَفَاكِهَةً وَأَبًّا﴾ کے متعلق دریافت کیا گیا توانہوں نے فرمایا: (أَيُّ سَمَاءٍ تُظِلُّنِي وَأَيُّ أَرْضٍ تُقِلُّنِي إذَا قُلْتُ فِي كِتَابِ اللهِ مَا لَا اَعْلَم) (اگر میں اللہ کی کتاب میں ایسی بات کہہ دوں جس کا علم نہیں تو مجھے کونسا آسمان اپنے نیچے اور کونسی زمین اپنے اوپر جگہ دے گی) (سنن سعيد بن منصور (39)، مصنف ابن ابي شيبه (10152)، فتح الباري (271/13)، وحسن اسناده الشيخ مشهور حسن.
2. یہی وہ منہج ہے جو اتحادِ امت کا راستہ ہے، کیونکہ اس منہج میں فکری انتشار سے بچاؤ کی ضمانت ہے.
3. منہج تفسیر بالماثور ایک مستحکم و پائیدار منہج ہے جس کے بنیادی اصول: تفسیر القرآن بالقرآن، تفسیر القرآن بالسنۃ، تفسیر القرآن بأقوال الصحابہ جیسی ٹھوس علمی بنیادوں پر قائم ہیں. جن کے پیچھے شرعی نصوص اور علمی و عقلی دلائل کارفرما ہیں.
4. منہج تفسیر بالماثور کی عملی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ نزول قرآن کا اصلی مقصد عمل ہے، اور عمل کے لیے ایک متعین اور طۓ شدہ مفہوم ضروری ہے، اور یہ مفہوم احادیث رسول ﷺ اور صحابہ وتابعین کی تفاسیر میں موجود ہے.
5. اس عملی اہمیت کے علاوہ منہج تفسیر بالماثور کی روحانی اہمیت یہ ہے کہ کلامِ باری تعالی اور احادیثِ نبویہ سے اس کی تفسیر انسان کے لیے ایک خوبصورت روحانی پیغام کا حامل ہے، جیساکہ ارشادِ باری تعالی: ﴿لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ﴾ کی نبوی تفسیر میں "زیادۃ" سے مراد (النَظَرُ إِلَى وَجْهِ اللهِ عَزَّوَجَلّ) (اللہ تعالی کے چہرہ اقدس کو دیکھنا ہے)، جیساکہ امام ابن جریر طبری نے اُبی بن کعب اور کعب بن عُجرہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، اور اصل حدیث صحیح مسلم میں ہے. گمراہ کن معتزلہ کی فلسفی تفسیروں کے برخلاف جو زیادہ سے مراد: اجر وثواب میں اضافہ لیتے ہیں، کیونکہ زیادہ مزید علیہ کی جنس سے ہوتا ہے.
6. منہج تفسیر بالماثور ہی ایمان و عمل کا راستہ ہے، رسول اللہ ﷺ کے ایمان افروز اقوال ہمیشہ ایمان و عقیدہ کو مضبوط کرتے آۓ ہیں، قرآن کریم کی تفسیر میں ایمان و عمل کی جو کیفیات منہج تفسیر بالماثور میں پائی جاتی ہیں کسی دوسرے منہج میں ممکن نہیں، بلکہ یہی ایمان و عمل قرآن کریم کا تقاضا ہے: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا﴾ (مومن تو صرف وہ لوگ ہیں کہ جن ہاں جب اللہ کا ذکر ہوتا ہے توان کے دل کانپ جاتے، اور جب ان پر قرآن کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں توان کا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے) (الانفال: 2). یہی تقوی قرآن کا اولین تقاضا اور مطلوب و مقصود ہے.
7. **صحابہ کرام کے ایمان جیسا ایمان**، ان کی اتباع جیسی اتباع، اور ان کے قرآن وسنت کے فہم جیسا فہم ہی راہِ جنت اور دینِ حق کا معیار ہے، ﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ ما آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا، وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّما هُمْ فِي شِقاقٍ﴾ (اگر وہ (امت کے لوگ) اسی طرح کا ایمان لاتے ہیں جس طرح کا (اۓ صحابہ) تم ایمان لائے ہو تو یقیناً ہدایت یافتہ ہو گئے، اور اگر منہ موڑیں تو بہت بڑی مخالفت میں ہیں)

(البقرة: 137)، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (وَتَفْتَرِقُ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ مِلَّةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً ، قَالُوا : وَمَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ ؟ قَالَ : مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي) (اور میری امت تہتر (73) فرقوں میں تقسیم ہو گی، ایک جماعت کے علاوہ سب جہنم میں جائیں گے، صحابہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! وہ کونسی جماعت ہے؟ آپ نے فرمایا: جو لوگ میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر ہوں گے) (الترمذي: 2641: حسن)، مذکورہ آیت وحدیث سے معلوم ہوا کہ: صحابہ کا منہج اور قرآن وسنت کا فہم نہ کہ صرف امتِ مسلمہ کے لیے معیار، بلکہ حجت ہے، چنانچہ نصوصِ وحی سے استدلال کے جو اصول صحابہ کرام کے ہیں انہیں اصولوں پر امت کو کاربند رہنے میں نجات ہے۔

8. **منہج تفسیر بالماثور کی لغوی اہمیت**: صحابہ کا فہم نہ صرف شرعی نقطہء نظر، بلکہ لغوی لحاظ سے بھی حجت اور معیار ہے، کیونکہ صحابہ ہی اہلِ زبان ہیں، ان کا زمانہ عجمی آمیزش سے محفوظ رہا، اسی لیے ان سے صادر ہونے والا ایک ایک لفظ رہتی دنیا کے لیے معیار اور کسوٹی ہے، چنانچہ شارحین کو اپنی تشریحات میں انہیں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے، نہ کہ بدعات کے مارے ہوئے عجمی فلسفے جو خود لغتِ عربی سے ناواقف تھے۔

مزید یہ کہ قرآن کریم شرعی وایمانی حقائق پر مشتمل وہ عربی ہے جس نے ایمان وإسلام، صلاۃ وزکاۃ، صدقہ وصیام، قذف ولعان جیسی مصطلحات کو نئے شرعی معانی پہنائے ہیں، جنہیں صرف لغتِ عربی اور اس کے قوامیس نہیں، بلکہ وحی، رسالت اور فہم صحابہ سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

9. **منہج تفسیر بالماثور کی علمی تاریخ**: قرآن کریم اپنے آپ میں محکم اور واضح ہے، مگر اس کی تفسیر وتوضیح با قاعدہ علم ہے، جس کی ایک شاندار تاریخ وتراث ہے، آج کا کوئی مفسر ایسا نہیں جو پہلی بار ہی قرآن کا فہم حاصل کرنے چلا ہو، چنانچہ علمِ تفسیر کی تاریخ وتراث سے منقطع ہو کر کوئی تفسیر کرنا، اور سلف صالحین سے بے گانہ ہو کر تدبر قرآن کوئی علمی انداز نہیں ہے۔

10. **منہج تفسیر بالماثور کی قانونی حیثیت**: قرآن کریم کتابِ شریعت وقانون ہے، جسے خود رب العالمین نے نازل فرما کر اس کے ایک ایک لفظ کے تشریح وبیان کی ذمہ داری لی ہے: (ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ) (پھر اسے بیان کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے) اور اسے بیان کرنے کے لیے شارح علیہ الصلاۃ والسلام کو حکم دیتے ہوئے فرمایا: (لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ) (تاکہ لوگوں کی طرف جو نازل ہوا آپ اسے بیان کریں)، چنانچہ آپ ﷺ نے اللہ کے حکم کے مطابق اس کی تشریح فرمائی، اور اسی منہج پر جماعتِ صحابہ کی تربیت کی، جو رہتی دنیا کے لیے مثال ونمونہ ہیں، چنانچہ جو شخص تفسیر میں ان قدیم المثال نظائر کی پروانہ کرے تو اس کا یہ عمل مردود اور نا قابل عمل قرار پائے گا۔

منہج تفسیر بالماثور پر اعتراضات اور ان کا جائزہ:

اس منہج پر کچھ اعتراضات اور إشکالات پیدا کیے گئے ہیں، جن کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔

1- کہا جاتا ہے کہ تفسیر بالماثور تدبر فی القرآن کے منافی ہے، جبکہ اللہ تعالی نے قرآن کے تدبر وتفکّر کا حکم دیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾ (بھلا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے (قفل) لگ گئے ہیں) (محمد: 24)، مزید فرمان ہے: ﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴾ (بھلا یہ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے، اگر یہ (قرآن) اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت بڑا اختلاف پاتے) (النساء: 82)، چنانچہ بعض "روشن خیالوں" کے خیال میں تفسیر بالماثور کا منہج تدبر وتفکر کی راہیں مسدود ہوتی ہیں،

جواب: درحقیقت کلام اللہ علوم ومعارف کاایسا سمندر ہے جس میں علم وحکمت کے جواہر پوشیدہ ہیں، اور اس سمندر میں جس قدر گہرائی سے غوطہ لگایا جائے اسی قدر اس سے یہ جواہرات برآمد ہوتے ہیں، چنانچہ تفسیر بالماثور کا منہج اس بحرِ بیکراں کی وسعتوں کو محدود کرنے کے لیے نہیں، بلکہ اس کی وسعتوں سے مستفید ہونے کے لیے صحیح طریقہ کار متعین کرنا ہے، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے اپنے آثار میں کلام اللہ کو محصور ومقید نہیں کیا، بلکہ اس کے فہم وتدبر کی وہ سمت متعین کی ہے جس کے بغیر فہم منتشر ہو کر ایسی سمت کا رخ اختیار کر سکتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کا مقصد ہی نہ ہو، کیونکہ لوگوں کی علمی وذہنی صلاحیتیں مختلف اور ان کی سوچ وفکر کے زاویے الگ الگ ہیں، اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ لازماً فلاں شخص کا تدبر ہی صحیح اور دوسرے کا غلط ہے. لہٰذا منہج تفسیر بالماثور وہ قاعدہ وضابطہ ہے جو وسعتِ فکری کے ساتھ ساتھ سلامتِ فکری کا بھی ضامن ہے.

یہ منہج علم وفکر کا جو رُخ متعین کرتا ہے یہ وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے متعین کیا ہے. (لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ) (تاکہ لوگوں کی طرف جو نازل ہوا آپ اسے بیان کریں).

احادیث وآثار سے کو چھوڑ کر قرآن سے استنباط واستدلال تو کوئی منافق بھی حاصل کر لیتا ہے، ارشادِ نبوی ہے: (لَا تُجَادِلُوا بِالْقُرْآنِ، وَلا تُكَذِّبُوا كِتَابَ اللَّهِ بَعْضَهُ بِبَعْضٍ، فَوَ اللَّهِ إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُجَادِلُ بِالْقُرْآنِ فَيُغْلَبُ، وَإِنَّ الْمُنَافِقَ لَيُجَادِلُ بِالْقُرْآنِ فَيَغْلِبُ) (قرآن کو اپنی بحث وتکرار کا ذریعہ نہ بناؤ، اور نہ ہی کتاب اللہ کی آیات کی ایک دوسری سے تکذیب کرو، اللہ کی قسم! بعض دفعہ مومن صادق قرآن کی روشنی میں بحث کرتا ہے، لیکن شکست کھاتا ہے، اور بعض دفعہ منافق قرآن کے ذریعہ بحث کر کے مؤمن کو شکست دے دیتا ہے) (السلسلة الصحيحه : 3447).

2- دوسرا اعتراض یہ ہے کہ منہج تفسیر بالماثور دورِ حاضر کے ترقی یافتہ ماحول اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے، صحابہ وتابعین کی بزرگی وتقدس میں کوئی شک نہیں، لیکن ترقی کی اس ہنگامہ خیز دنیا میں اس کے ساتھ چلنا ناممکن ہے.

جواب: فہمِ قرآن میں بالخصوص، اور فہمِ دین میں بالعموم عہدِ سلف کی اتباع کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ دورِ حاضر کے نئے مسائل اور فقہی مشکلات کے حل کا راستہ بند کر کے اجتہاد کے دروازے بند ہو جائیں، اور نہ ہی یہ کہ قرآن کا فہم حاصل ہو چکا ہے، اور مزید اس کے فہم وتدبر کی راہیں بند ہو چکی ہیں، بلکہ خود صحابہ کرام نے ان کے زمانہ میں پیش آنے والے مسائل کے کامیاب حل پیش کیے، اور پھر صحابہ سے فیض یافتہ تابعین نے اسی طریقہ پر چلتے ہوئے اپنے دور کے تقاضوں کو بخوبی پورا کیا، ان کی اس قدر علمی وعملی کوششوں کے باوجود: اصول وقواعد میں یکسانیت تھی، ان کے مصادر طئے شدہ تھے، جو کہ قرآن، حدیث اور صحابہ وسلف کا منہج تھا، تاکہ عجائبات قرآن کے دروازے بھی بند نہ ہوں، اور سلف صالحین سے بھی رشتہ ٹوٹنے نہ پائے، یہی تفسیر بالماثور کا منہج ہے، فہمِ قرآن کے لیے احادیث رسول ﷺ اور روایت صحابہ کی طرف رجوع کرنا آخر اسی بات کی ضمانت ہے کہ ہمارا فہمِ قرآن خالص وحی پر مبنی ہو، اس کے بعد ضرورت عصرِ حاضر کے مسائل کو وحی کے مطابق حل کرنے کی ہے.

اس مغالطے کی اصل وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات الحاد ودہریت اور اباحیت پسند لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اسلام وقرآن کا سرٹیفکیٹ حاصل کر کے آزاد خیال بھی رہیں، ان کی اباحیت اور خواہشاتِ نفس کو قرآن کی سند حاصل ہو جائے، ظاہر ہے کہ تفسیر بالماثور کا منہج ان ملحدوں زندیقوں کی خواہشات کا ساتھ نہیں دیتا، کیونکہ یہ منہج اس معنی میں زمانے سے ہم رنگ ہونا جانتا ہی نہیں، ﴿صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً﴾ (یہ (وحی) تو اللہ کا دیا ہوا رنگ ہے، اور اللہ سے بہتر کون رنگ دے سکتا ہے).

3- تفسیر القرآن بالحدیث کے بارے میں اِشکالات:

تفسیر القرآن بالحدیث کے بارے دو بڑے اِشکالات ہیں: ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ سے تفسیر قرآن کی بہت کم روایات پائی جاتی ہیں، اور دوسرا یہ کہ تفسیری روایات اکثر وبیشتر پایہء ثبوت تک نہیں پہنچتی، توجب یہ ثابت ہی نہیں تو تفسیر قرآن میں ان پر اعتماد کیسے کیا جاسکتا ہے؟

پہلے اعتراض کی اصل وجہ یہ ہے کہ: موجودہ طرزِ تفسیر کی طرح رسول اللہ ﷺ نے بھی ایک ایک آیت کی تلاوت فرما کر اس کے ہر لفظ کی تشریح بیان کیوں نہ فرمائی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا عہد نبوت کا تقاضا نہیں تھا، کیونکہ صحابہ کرام کو عرب ہونے کی بناپر اس طرزِ تفسیر کی ضرورت نہیں تھی. اس کے بر عکس رسول اللہ ﷺ نے اپنے خاص انداز سے اس وقت کے تقاضوں کے مطابق قرآن کی علمی و عملی تفسیر فرمائی ہے، چنانچہ کبھی تو آپ نے کوئی مفہوم بیان کرکے اس سے متعلقہ آیت تلاوت فرمائی، اور کبھی آیت تلاوت فرما کر اس کی تفسیر بیان کی، جیسا کہ صحیح بخاری میں آپ نے زکاۃ نہ ادا کرنے والے کے بارے فرمایا: اس کی دولت کا گنجے سانپ کی شکل میں طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالا جائے گا، اور وہ سانپ اس کی دونوں باچھوں سے پکڑ کر کہے گا: (اَنا مَالُك، اَنا كَنْزُك) اور پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴾ (جو لوگ اللہ تعالی کے دیے ہوئے مال میں بخل کرتے ہیں، وہ اس بخل کو اپنے حق میں اچھا نہ سمجھیں، بلکہ وہ ان کے لیے بُرا ہے، وہ جس مال میں بخل کرتے ہیں روزِ قیامت اسی کا طوق بنا کر ان کی گردنوں میں ڈالا جائے گا، اور آسمان وزمین کا اللہ ہی وارث ہے، اور جو عمل تم کرتے ہو اللہ تعالی اسے خوب جانتا ہے) (آل عمران: 180)، اور کبھی صحابہ کو کسی آیت میں اشکال ہوا تو آپ ﷺ نے اس کی تشریح فرمائی، جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (جب یہ آیت نازل ہوئی :﴿ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ شَقَّ ذَلِكَ عَلَى أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَقَالُوا: أَيُّنَا لاَ يَظْلِمُ نَفْسَهُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: «لَيْسَ هُوَ كَمَا تَظُنُّونَ، إِنَّمَا هُوَ كَمَا قَالَ لُقْمَانُ لابْنِهِ :﴿ يَا بُنَيَّ لاَ تُشْرِكْ بِالله إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾) (وہ لوگ جو ایمان لائے اور پھر اپنے ایمان میں کسی ظلم کی امیزش نہ کی) تو اصحاب رسول ﷺ پر بہت گراں گذری، اور انہوں نے کہا: ہم میں سے کون ہے جو اپنی جان پر ظلم نہ کرتا ہو؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ نہیں جو تم خیال کرتے ہو، یہ تو لقمان علیہ السلام کا اپنے بیٹے کو نصیحت کرنا ہے: ﴿ يَا بُنَيَّ لاَ تُشْرِكْ بِالله إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾(بیٹا! اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، کیونکہ شرک ہی سب سے بڑا ظلم ہے) (متفق عليه) .

احکام ومسائل سے متعلقہ تمام آیات کو نبی کریم ﷺ نے اپنی قولی وفعلی اور تقریری احادیث سے بیان فرمایا، بلکہ آپ ﷺ تو قرآن کی چلتی پھرتی تصویر تھے: (كَانَ خُلُقُهُ الْقُرآن)، اور پھر یہ کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات اپنے آپ میں خود اتنی واضح ہیں کہ صحابہ کرام کو ان کی تشریح وتفسیر کی ضرورت ہی نہ تھی. چنانچہ مفسرِ قرآن کا فریضہ ہے کہ وہ زیر تفسیر آیت سے متعلقہ احادیث کو جمع کرے، اور ان کی روشنی اس کی وضاحت کرے.

4- جہاں تک دوسرا اشکال ہے کہ تفسیری روایات اکثر وبیشتر پایہءِ ثبوت تک نہیں پہنچتی، جس کا اعتراف خود امام اہل السنہ: امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے کیا ہے: (ثَلاثَةٌ لَيْسَ لَهَا إِسْنَادٌ: اَلتَفْسِيْر، وَالْمَلَاحِم، وَالمَغَازِي) (تین موضوعات کی کوئی سند نہیں: تفسیر، احداث وواقعات اور غزوات) (الجامع لاخلاق الراوي: 162/2).

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد علمِ مغازی، ملاحم، اور تفسیر کی وہ تفصیلات ومرویات ہیں جو عموماً بے سند ہوتی ہیں، بعض واقعات کی تفصیلات میں متعدد اِسرائیلی روایات وحکایات، اور مختلف سورتوں کی فضیلت میں موضوع روایات بیان کی جاتی ہیں، چنانچہ اس طرح کی تفصیلات بے سند ہیں، اور یہی امام احمد بن حنبل کا مقصد ہے، نہ کہ مستند احادیث اور صحابہ کرام کی مستند روایات جو کہ تفسیر بألماثور کے اصل مصادر ہیں.

تفسیر بألماثور کے مراتب:

1. تفسیر القرآن بالقرآن
2. تفسیر القرآن بالسنۃ
3. تفسیر القرآن بأقوال الصحابہ
4. تفسیر القرآن بأقوال التابعین
5. تفسیر القرآن باللغۃ العربیۃ
6. تفسیر القرآن بأسباب النزول
7. تفسیر القرآن بالإسرائیلیات

1- تفسیر القرآن بالقرآن: اور اس کے اصول وضوابط:

قرآن کریم نے بعض حقائق کو بیان کرتے ہوئے متعدد مقامات پر ان کو دہرایا ہے، اگرچہ ہر مقام پر اندازِ بیان مختلف ہوتا ہے، اگر ایک مقام پر مختصر ہے، تو دوسرے مقام پر تفصیل ہے، اگر کہیں اطلاق ہے تو دوسری آیات میں اس کی تقیید ہے، اور کسی مقام پر عموم ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تخصیص فرمادی ہے، اسی لیے کہا گیا ہے: (**القرآنُ يُفَسِّرُ بَعْضَهُ بَعْضاً**) قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی وضاحت کرتا ہے. ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اگر کوئی کہے کہ تفسیر کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب ہے کہ: سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی خود قرآن کی روشنی میں تفسیر کی جائے"، اور علامہ شنقیطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "علماء کا اس پر اجماع ہے کہ تفسیر کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ اللہ کی کتاب کی خود اسی سے ہی تفسیر کی جائے، کیونکہ کلام اللہ کو اللہ سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا" (أضواء البيان: 7/1).

تفسير القرآن بالقرآن كي اقسام:

1- **قرآن کریم کسی چیز کی تفسیر بیان کرے، جسے قطعی طور پر اس کی تفسیر قرار دیا جائے**، جیساکہ: ﴿ **وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ (1) وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ (2) النَّجْمُ الثَّاقِبُ** ﴾ (الطارق: 1-3)، یہاں قطعی طور پر (**النَّجْمُ الثَّاقِبُ**) (**الطَّارِقِ**) کی تفسیر ہے.

2- رسول اللہ ﷺ کسی آیت کی تفسیر اپنی زبانِ اقدس سے دوسری آیت کے ذریعے بیان فرمادیں، صحیحین میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ **الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ** ﴾ **شَقَّ ذَلِكَ عَلَى أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَقَالُوا: أَيُّنَا لاَ يَظْلِمُ نَفْسَهُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: «لَيْسَ هُوَ كَمَا تَظُنُّونَ، إِنَّمَا هُوَ كَمَا قَالَ لُقْمَانُ لابْنِهِ: ﴿ يَا بُنَيَّ لاَ تُشْرِكْ بِالله إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾** (وہ لوگ جو ایمان لائے اور پھر اپنے ایمان میں کسی ظلم کی امیزش نہ کی) تو اصحابِ رسول ﷺ پر بہت گراں گذری، اور انہوں نے کہا: ہم میں سے کون

ہے جو اپنی جان پر ظلم نہ کرتا ہو؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ نہیں جو تم خیال کرتے ہو، یہ تو لقمان علیہ السلام کا اپنے بیٹے کو نصیحت کرنا ہے: ﴿ يَا بُنَيَّ لاَ تُشْرِكْ بِالله إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾ (بیٹا! اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، کیونکہ شرک ہی سب سے بڑا ظلم ہے) (متفق عليه). اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ایک آیت کی دوسری آیت سے تفسیر فرمائی.

3- کوئی صحابی قرآن کریم کی کسی آیت کی دوسری آیت سے تفسیر کرے، بشرطیکہ کسی دوسرے صحابی سے اس کی مخالفت ثابت نہ ہو، جیساکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ﴿وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوعِ﴾ (الطور: 5) کی تفسیر فرماتے ہوئے کہا: "اس سے مراد آسمان ہے"، پھر اپنے قول کی تائید میں یہ آیت پیش کرتے ہیں: ﴿وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا﴾ (اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا) (الأنبياء:32).

4- علماء امت متفقہ طور پر کسی آیت کو دوسری آیت کی تفسیر قرار دیں، جس کی مثالیں ان انبیاء کے واقعات ہیں جو قرآن کریم میں متعدد بار مختلف انداز سے دہرائے گئے ہیں، جنہیں مفسرین ایک دوسری آیات کی تفسیر قرار دیتے ہیں، بشرطیکہ اس تفسیر پر معتبر علماء کا اختلاف منقول نہ ہو.

5- اس کی پانچویں قسم یہ ہے کہ کوئی مفسر اپنی ذاتی رائے سے کسی آیت کو دوسری آیت کی تفسیر قرار دے، لیکن یہاں دیکھا جائے گا کیا واقعتاً اس کی یہ رائے صحیح ہے، جیساکہ علامہ شنقیطی رحمہ اللہ (ثَلاثَةَ قُرُوءٍ) میں "قرء" سے مراد طُہر لیتے ہیں، اور اس کی دلیل (فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ) پیش کرتے ہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے عدت کو طُہر کا معنی دیا ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ قُرْء سے مراد مطلوبہ عدت ہے، جو کہ طہر ہے.

تفسیر القرآن بالقرآن کی چند اہم صورتیں

1- قرآنی کلمات والفاظ کی قرآن ہی سے تفسیر:

جیساکہ سورۃ الأعراف میں ہے: ﴿ فَانبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا﴾ چنانچہ ﴿ فَانبَجَسَتْ﴾ کی تفسیر دوسری آیت میں اس طرح سے آئی ہے: ﴿فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْن﴾ (البقرة: 60).

2- قراءات سے قرآن کی قرآن سے تفسیر:

قراءات کی روشنی میں بعض مفردات کی تفسیر اور مفاہیم کی تعیین ہو جاتی ہے، اور یہ اصولِ تفسیر کے قواعد میں سے ہے کہ: (الْقِرَاءَاتُ يُبَيِّنُ بَعْضُهَا بَعْضاً) ایک قراءت دوسری قراءت کی تفسیر کرتی ہے، جیساکہ حالتِ حیض میں عورت سے صحبت نہ کرنے کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهُرْنَ﴾ (اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان سے مقاربت نہ کرو)، (يَطْهُرْنَ) کی تفسیر دوسری قراءت سے ہوتی ہے، جس میں (يَطَّهَّرْنَ) طاء اور ھاء کی تشدید سے طہارت میں مبالغہ کا معنی ہے، یعنی حیض ختم ہونے کے بعد غسل کر لینا.

3- قرآن کے مُجْمَل یا مُبْہَم کی مُبَیَّن سے تفسیر: (مُجْمَل، مُبْہَم اور مُبَیَّن)

مُجْمَل اسے کہتے ہیں جس میں دو یا دو سے زیادہ معانی کا احتمال ہو، اور کسی ایک معنی کی ترجیح نہ ہو، اور قرآن کریم میں کچھ مجمل الفاظ ہیں، جن کو خود قرآن ہی دوسرے مقامات پر مُبَیَّن سے واضح کرتا اور مُبْہَم کی تعیین کرتا ہے. جیساکہ قصہ آدم علیہ السلام میں ہے: ﴿فَتَلَقَّى آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ﴾ (آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے) یہ کلمات مبہم

ہیں ، جنہیں خود باری تعالی نے دوسرے مقام پر بیان فرما دیا: ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ معلوم ہوا کہ وہ کلمات یہ دعا تھی ، نہ کہ وہ موضوع روایات کہ آدم علیہ السلام نے عرش پر کلمہ (لا إله إلا الله محمد رسول الله) پڑھا اور محمد ﷺ کے وسیلہ سے دعا کی .

4- قرآن کے مُطْلَق کی تَقْيِيد : (مُطْلَق ومُقَيَّد)

مُطْلَق ایسے لفظ کو کہتے ہیں جو کسی حقیقت پر بلا قید دلالت کرے، مطلق اور مقید کے بارے تفسیرِ قرآن کا قاعدہ یہ ہے کہ جب تک دلیل نہ ہو اس وقت تک مطلق الفاظ کو اپنے اطلاق پر ہی محمول کیا جائے، جیسا کہ ﴿فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ میں أَيَّامٍ أُخَرَ سے رمضان کے بعد وہ دن مراد ہیں جن میں روزوں کی قضا دینا ہے، اب چونکہ یہاں یہ لفظ مطلقاً آیا ہے، لہٰذا اسے مطلق ہی رکھا جائے اور اس میں لگاتار قضا کی شرط لگانا صحیح نہیں ہے .

لیکن جب مطلق کو مقید پر محمول کرنے کی شرط پائی جائے تو اس وقت مطلق کو مقید پر محمول کرنا ضروری ہوگا، جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ﴾ جس کے اطلاق سے ہر طرح کا خون حرام ثابت ہوا، لیکن اس مطلق کی تقیید سورۃ الانعام میں کی گئی: ﴿إلا أن يكون ميتةً أو دمًا مسفوحًا﴾ معلوم ہوا کہ : جانور کا جو خون حرام کیا گیا ہے وہ بہا ہوا خون ہے نہ کہ رگوں میں باقی رہ جانے والا .

5- عموماتِ قرآنیہ کی دوسری آیات سے تخصیص : (عام وخاص)

عام سے مراد وہ لفظ ہے جو اپنے تمام معانی پر محیط ہو، قرآنِ کریم میں بعض دفعہ ایک عام حکم بیان ہوتا ہے، اور کسی دوسرے مقام پر اس کی تخصیصات کا ذکر ہوتا ہے، جن سے ان عمومات کی تخصیص ہوتی ہے، جیسا کہ ﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ﴾ میں طلاق شدہ عورتوں کی عدت تین حیض بیان ہوئی ہے، لیکن دوسری آیت میں حاملہ کی عدت وضع حمل تک مقرر کر کے اس عموم کی تخصیص کی گئی : ﴿وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَن يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ اور جن عورتوں کو ازدواجی تعلقات سے پہلے ہی طلاق دی گئی ہو ان کے لیے کوئی عدت نہیں: ﴿فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا ﴾ .

6- قرآن کریم کی روشنی میں قرآنی اصطلاحات ومفاہیم کا تعین :

قرآن کریم میں مختلف حقائق ومعارف کو متعدد مقامات پر مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے، اس لیے تفسیر القرآن بالقرآن کے لیے ضروری ہے کہ ایک ہی موضوع سے متعلقہ آیات جمع کی جائیں، اور انہیں باہم ملا کر ان پر غور وفکر سے صحیح مفاہیم کا تعین کیا جائے، جیسا کہ سورۃ الفاتحہ میں صراطِ مستقیم کی ہدایت پانے کی دعا ہے ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴾، جب اس سے متعلقہ آیات جمع کی جائیں تو صراطِ مستقیم کی حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے، چنانچہ قرآن واضح کرتا ہے کہ صراطِ مستقیم : مخلص ہو کر اللہ کی عبادت کرنا ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ﴾ (آل عمران: 56)، نیز صراطِ مستقیم کی یہ شرط بھی ہے کہ شیطان کی عبادت اجتناب کیا جائے: ﴿أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ . وَأَنِ اعْبُدُونِي ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ﴾ (يس: 60-61) ، اور پھر اس صراطِ مستقیم کی عملی مثال پیش کرتے ہوئے فرمایا: ﴿قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (الانعام: 161)، اور پھر صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے قرآن کریم کو معیار قرار دیا : ﴿إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ﴾ (بني إسرائيل:9)

7- **تفسیر القرآن بالقرآن کاایک انداز یہ بھی ہے کہ مجمل قصص وواقعات** کی تفصیلی مقامات کی روشنی میں تفسیر پیش کی جاتی ہے. اسی طرح آفاق میں پھیلی ہوئی کونی آیات کاانداز ہے، کہیں بطورِ اجمال تذکرہ ہوا ہے، اور دوسرے مقامات پر ان کے اہداف ومقاصد بیان کیے گئے ہیں.

8- **اسباب ووجوہات کی وضاحت :**

قرآن کریم کے بعض مقامات پر کسی چیز کاتذکرہ اسباب کی وضاحت کیے بغیر کیا جاتا ہے، اور دوسرے مقامات پر اس کے اسباب بیان کیے جاتے ہیں، جیساکہ سورۃالبقرۃ میں بنی إسرائیل کے دلوں کی سختی کا بیان ہوا: ﴿ **ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ** ﴾، اور پھر سورۃالمائدۃ میں اس سختی کاسبب بیان کیا گیا:﴿ **فَبِمَا نَقْضِهِم مِّيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً** ﴾، اسی طرح سورۃالحدید میں اس کی دوسری وجہ بیان کی گئی : ﴿ **فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ** ﴾ .

تفسیر القرآن بالسنہ النبویہ، اور اس کے اصول وضوابط

منہج تفسیر بالماثور میں قرآن کریم کے بعد سنتِ نبوی تفسیرِ قرآن کا سب سے بڑا مصدر ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالی کی طرف اس قرآن کو بیان کرنے کی ذمہ داری دی گئی تھی: ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ "ہم نے یہ ذکر (قرآن) تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس کی تشریح وتوضیح کرتے جاؤ جو اُن کے لیے اتاری گئی ہے، اور تاکہ لوگ (خود بھی) غور وفکر کریں﴾ (النحل: 44)، چنانچہ رسول کریم ﷺ اس قرآن کے سب سے پہلے معلم ومفسر ہیں.

مضمون وموضوع کے لحاظ سے قرآن وحدیث کا باہمی تعلق:

قرآن وحدیث مضامین کے باہمی تعلق کے لحاظ سے تین اقسام پر مشتمل ہی:

1- قرآنی مضامین پر مشتمل احادیث: یعنی وہ احادیث جن میں وہی مضمون ہے جو قرآن کریم میں موجود ہے. جیساکہ ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿ مَّن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (النساء: 80)، بالکل یہی مضمون رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبانِ اقدس سے بیان فرمایا: (مَن أطاعَنِي فقَدْ أطاعَ اللَّهَ) (متفق عليه).

2- قرآنی آیات کی شارح احادیث: یعنی وہ احادیث جن میں قرآن کے اجمال کی تشریح، ابہام کی تعیین، اطلاق کی تقیید، اختصار کی تفصیل، یا قرآنی احکام پر عمل کی کیفیات بیان کی گئی ہیں، جیساکہ نماز سے متعلقہ احادیث جن میں نمازوں کی تعداد، رکعات، کیفیات اور ترتیبات کا بیان ہے، یہ سب ﴿اَقِيمُوا الصَّلاة﴾ کی تشریحات ہیں.

3- مستقل اِضافی احادیث: یعنی احادیث کے وہ موضوعات جن کے بارے قرآن خاموش ہے، جیساکہ رسول اللہ ﷺ نے حرم مدنی کا بیان کرتے ہوئے فرمایا: (إنَّهَا حَرَمٌ آمِنٌ) (بلاشبہ یہ پرامن حرم ہے) (مسلم: 3341)، اسی طرح رضاعت سے محرم رشتوں کے بارے فرمانِ نبوی ہے: (إنَّه يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعَةِ ما يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ) (رضاعت سے بھی وہی رشتے حرام قرار پاتے ہیں جس سے خونی (نسب) کے رشتے حرام ہوتے ہیں). (مسلم:1445)، احکام ومسائل کے علاوہ قصص وواقعات وغیرہ کی مثالیں ہیں جن کا قرآن کریم میں تذکرہ نہیں ہے، جیساکہ اصحابِ غار، اور جریج العابد وغیرہ کا واقعہ ہے.

تفسیرِ القرآن بالحدیث کی انواع واقسام:

1- قرآنی الفاظ وکلمات کی حدیث سے تفسیر: جیساکہ ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾ (البقرة: 143)، صحیح بخاری میں ارشادِ نبوی ہے: (الْوَسَطُ: الْعَدْلُ) (البخاري: 44).

2- عموماتِ قرآنیہ کی حدیث سے تخصیص: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ ﴾ شَقَّ ذَلِكَ عَلَى أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ ﷺ وَقَالُوا: أَيُّنَا لاَ يَظْلِمُ نَفْسَهُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: «لَيْسَ هُوَ كَمَا تَظُنُّونَ، إِنَّمَا هُوَ كَمَا قَالَ لُقْمَانُ لاِبْنِهِ: ﴿ يَا بُنَيَّ لاَ تُشْرِكْ بِالله إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾) (وہ لوگ جو ایمان لائے اور پھر اپنے ایمان میں کسی ظلم کی امیزش نہ کی) تو اصحابِ رسول ﷺ پر بہت گراں گذری، اور انہوں نے کہا: ہم میں سے کون ہے جو اپنی جان پر ظلم نہ کرتا ہو؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ

نہیں جو تم خیال کرتے ہو، یہ تو لقمان علیہ السلام کا اپنے بیٹے کو نصیحت کرنا ہے: ﴿ يَا بُنَيَّ لاَ تُشْرِكْ بِالله إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ﴾ (بیٹا ! اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، کیونکہ شرک ہی سب سے بڑا ظلم ہے) (متفق عليه). اس حدیث میں لفظ ظُلْمٌ کے عموم کی رسول اللہ ﷺ نے تخصیص کرتے ہوئے واضح کیا کہ یہ ہر طرح کا ظلم نہیں، بلکہ سب سے بڑا ظلم شرک ہے.

3- قرآنی اطلاقات کی احادیث سے تقیید: قرآن کریم میں کئی مقامات پر حکم کو مطلقاً بیان کیا گیا ہے، ان کی تقیید کی ضرورت کے پیشِ نظر احادیث نبویہ میں ان کو مقید کیا گیا ہے، جیسا کہ: ﴿ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا ﴾ (المائدة: 38) کی رو سے ہر چھوٹی بڑی چوری پر ہاتھ کاٹنا واجب ہوتا، لیکن احادیث میں اس سزا کے لیے نصاب اور شروط عائد کی گئی ہیں.

4- احادیث نبویہ سے قرآنی مُبْهَمَات کی تعیین: بعض قرآنی نصوص کے عام معانی واضح ہونے کے باوجود اس سے کونسی خاص چیز مراد ہے؟ اس حد تک ابہام پایا جاتا ہے، احادیث نبویہ اس ابہام کا ازالہ کرتی ہیں، جیسا کہ: ﴿ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ ﴾ میں بنی إسرائیل کونسی بات کہی تھی؟ اس میں ابہام ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس ابہام کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا: (حَبَّةٌ فِي شَعْرَة) (بالی میں دانہ) (الترمذي: 2956، وقال: حسن صحيح).

5- قرآن کریم کے اجمالی طور پر بیان کردہ فرائض، واجبات، مستحبات، محرمات، مکروہات اور مباحات کی مکمل تفسیر کا ذخیرہ حدیث نبوی میں محفوظ ہے، جیسا کہ اللہ تعالی نے قرآن کریم کے کئی مقامات پر ﴿ اَقِيمُوا الصَّلَاة ﴾ کا حکم دیا، اور آپ ﷺ نے نماز کی تفصیلات اور اس کا طریقہ بتانے کے ساتھ ساتھ عملًا کرکے دیکھایا.

6- اس کے علاوہ قرآن میں گمراہ کن لوگوں کے غلط عقائد و نظریات وافعال کی تردید ہے، احادیث نبویہ ان کی تفصیلات بیان کرتی ہیں، اور قرآن میں اللہ تعالی کی عظمت کی نشانیاں، توحید کے دلائل، اللہ کی نعمتیں، روز قیامت، جزاء اور سزا، جنت اور جہنم، انبیاء اور ان کی اقوام کے واقعات، اہلِ ایمان کے فضائل، اور اہل کفر کے رذائل وغیرہ کے مجملات کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں.

تفسیر القرآن بأقوال الصحابہ

منہج تفسیر بالماثور میں قرآن اور سنت سے تفسیر کے بعد صحابہ کی تفسیر کا درجہ ہے.

تفسیر صحابہ کی مختلف انواع اور ان کے احکامات:

جس طرح ماہر ترین معلم کے تلامذہ کو دوسروں پر برتری حاصل ہوتی ہے، اسی طرح مسجد نبوی کے حلقات قرآنیہ میں معلم البشریہ، رسول ہدی ﷺ سے فیضیاب ہونے والوں سے بڑھ کر بھی کوئی مستند نہیں ہو سکتا.

لیکن چونکہ صحابہ کرام فہم قرآن میں مختلف مراتب کے حامل ہیں، اسی تفاوت کی وجہ سے ان سے منقول آثار بھی مختلف ہیں:

1- مرفوع حکمی:

جو صحابی اسرائیلیات روایت کرنے سے معروف نہ ہو، اور ایسی تفسیر پیش کرے جو عقل واجتہاد سے معلوم نہ کی جا سکتی ہو، بلکہ محض نقل پر مبنی ہو تو صحابی کی اس تفسیر کو مرفوع حکمی کا درجہ حاصل ہوگا، ابن حجر فرماتے ہیں: "فی الحقیقت اگر صحابی ایسی تفسیر پیش کرے جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو اور نہ ہی لغت عرب سے منقول ہو تو اسے مرفوع روایت کا درجہ حاصل ہے، ورنہ نہیں"، جیسا کہ: ابتداء خلق سے متعلقہ معلومات ہیں، علامات قیامت، احوال برزخ، احوال قیامت، جنت اور جہنم،

سابقہ قوموں کے حالات، مستقبل اور فتن وملاحم کی خبریں، ثواب وعقاب جیسے امور غیب ہیں، مثلاً ﴿وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ﴾ کی تفسیر میں ابن مسعود فرماتے ہیں: "رَأَى جِبْرِيْلَ لَهُ سِتُّمِائَةِ جَنَاحٍ" آپ نے جبریل کو چھ سو 600 پروں میں دیکھا. (البخاري: 3233، 4853، 4856، 4857، مسلم: 174).

مرفوع حکمی کے بارے ایک اہم حقیقت:

صحابہ کرام اپنے تقوی، ورع اور حزم واحتیاط کے اعلی درجہ پر فائز ہونے کی وجہ سے تفسیر اور احادیث کو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرنے میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کی تفسیر کا بڑا حصہ درحقیقت نبی کریم ﷺ سے ماخوذ ہے، لیکن یہ مرفوعاً روایت نہیں ہے، اسی ضمن ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی طرف کسی بات کی نسبت کرتے ہوئے ان پر ہیبت طاری ہوتی تھی، اسے بہت عظیم امر گردانتے تھے، کہ کہیں کمی بیشی نہ ہو جائے، کوئی چیز انہوں نے نبی کریم ﷺ سے کئی مرتبہ سنی ہوتی تو اسے بیان کرتے ہوئے نہ سماع کی صراحت کرتے، اور نہ اسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتے. سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے دمشق کی سیڑھیوں پر گری لاشیں دیکھی تو فرمایا: "كِلَابُ النَّارِ، شَرُّ قَتْلَى تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ، خَيْرُ النَّاسِ مَنْ قَتَلُوهُ، پھر پڑھتے ہیں: ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ﴾، ابوغالب —راوی— کہتے ہیں میں نے سیدنا ابوامامہ سے پوچھا: کیا آپ نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے؟ انہوں نے کہا: "اگر میں نے صرف ایک، دو، تین یا چار دفعہ سنا ہوتا یہ تمہارے سامنے بیان نہ کرتا".

2- صحابہ کے تفسیری اجماعات:

اگر کسی صحابی سے تفسیر منقول ہو، اور دیگر صحابہ کرام سے کسی طرح کا اختلاف منقول نہ ہو تو ان کی ایسی تفسیر بدرجہ اجماع اور حجت ہوگی.

3- صحابی کا مشہور تفسیری قول:

اگر کسی آیت کی تفسیر میں ایک صحابی کا قول مل جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ قول مشہور ہے، جبکہ اس کے مخالف کسی صحابی کا قول نہ ہو تو جمہور علماء کے نزدیک اسے "اجماع سکوتی" کا درجہ حاصل ہے، اور یہ قول حجت ہوگا. ابن تیمیہ فرماتے ہیں: اقوالِ صحابہ اگر معروف ہو جائیں اور اپنے عہد میں ان پر کوئی اعتراض بھی نہ ہو تو جمہور علماء کے نزدیک حجت ہیں.

4- صحابی کا غیر مشہور قول:

اگر کسی آیت کی تفسیر میں صحابی کا ایسا قول مل جائے جو غیر مشہور ہو، تو ایسے قول کی حجیت کے بارے میں اختلاف ہے، جمہور ائمہ: ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد، اور إسحاق بن راہویہ کے نزدیک حجت ہے.

5- صحابی کے اختلافی اقوال:

اگر صحابہ کرام کو ایسے اقوال مل جائیں جو باہم متعارض ہوں تو ایسی صورت میں دیگر دلائل کی روشنی میں ترجیح کرتے ہوئے زیادہ صحیح کو اختیار کیا جائے گا، ابن تیمیہ فرماتے ہیں: اگر صحابہ باہم مختلف ہوں تو فیصلہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹایا جائے گا، اور باتفاق علماء ایسی اختلافی صورت میں صحابہ کے اقوال حجت نہ ہوں گے.

6- صحابی کی لغوی تفسیر:

اگر صحابی قرآن کے کسی کلمہ یا جملہ کی لغوی تفسیر کرے تو یہ بھی حجت ہے، کیونکہ صحابہ کرام خود اہلِ زبان ہیں، امام بخاری ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے (القَسْوَرَة): قَسْوَرَ الاَسَد، کی تفسیر میں فرماتے ہیں: قسورہ سے مراد: شیر اور اس کا حملہ ہے.

7- صحابی کا اسرائیلیات سے مستفاد قول:

اگر کسی صحابی نے اہل کتاب کے علماء یا ان کی کتابوں سے تفسیر نقل کی ہو تو نہ یہ صحابی کی رائے قرار دی جائے اور نہ ہی اسے مرفوع کا حکم دیا جائے گا.

تفسیر القرآن بأقوال التابعین

تابعین کی تفسیر کی اہمیت:

1- تابعین نے تفسیر براہ راست صحابہ کرام سے سیکھی ہے.

2- تابعین خیر القرون میں شامل ہیں.

3- تابعین زبان دانی اور اسالیبِ عرب سے واقفیت میں بعد والوں کی بہ نسبت بہتر ہے.

تفسیر تابعین کی اقسام اور ان کے احکامات:

صحابہ کرام کی طرح تابعین سے بھی تفسیر کے مختلف انداز ہیں:

1- تفسیرِ مرسل:

تابعی اگر اسباب نزول، قصصِ انبیاء، اور فتن وملاحم جیسے غیبی امور کی تفسیر بیان کرے جو عقل واجتہاد سے ممکن نہ ہو تو ایسی تفسیر کا وہی حکم ہوگا جو مرسل حدیث کا ہے، چنانچہ قبولِ مرسل کی جو شروط اہلِ علم کے ہاں طے ہیں، تفسیر مرسل میں بھی وہی شروط عائد ہوں گی، اگر تابعی کی یہ تفسیر احادیث کے مطابق ہو تو مقبول ہو گی، جیسا کہ امام مجاہد: ﴿اسْتَوَى إِلى السَّمَاءِ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: **"عَلَا عَلَى الْعَرْش"**، علامہ ابن جریر اس کو صحیح قرار دیتے ہیں [8/ 175]

اور یہ تفسیر اگر احادیث کے مخالف ہو تو مقبول نہیں ہو گی، جیسا کہ امام مجاہد نے ﴿**عَسَىٰ أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا**﴾ کی تفسیر میں کہتے ہیں: (**إِقْعَادُهُ عَلَى العَرْش**) (آپ ﷺ کا عرش پر بیٹھایا جانا)، تو یہ تفسیر آپ کی حدیث الشفاعہ کے خلاف ہے.

2- اجماعِ تابعین:

کسی تفسیر پر تابعین کا اجماع بلاشبہ حجت ہے، ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اَمّا إذا اجْتَمَعُوا عَلَي شَيءٍ فَلا يُرتابُ في كَونه حُجَة" "جب تابعین کسی چیز پر متفق ہو جائیں تو وہ بلاشبہ حجت ہے"، اور اسی طرح کا قول امام شعبہ بن الحجاج سے منقول ہے۔

3- تفسیرِ القرآن میں تابعین کے اختلافی اقوال:

اگر تابعین سے مختلف تفسیری اقوال منقول ہوں تو وہ یقیناً حجت نہیں ہیں، ابن تیمیہ رحمہ اللہ شعبہ بن الحجاج نقل کرتے ہیں: اگر تابعین کے اقوال فقہی مسائل میں حجت نہیں تو تفسیر میں کیونکر حجت ہو سکتے ہیں! نہ ایک دوسرے کے لیے اور نہ ہی بعد والوں کے لیے، بلکہ اس صورت میں اقوال صحابہ یا لغتِ عرب کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

4- تابعی کی تفسیر اگر دوسرے تابعی کے مخالف نہ ہو:

کسی تابعی کی ایسی تفسیر جس کی دوسرے تابعین کی طرف موافقت یا مخالفت نہ ہو تو جمہور اہلِ علم کے ہاں وہ حجت نہیں ہوگی، کیونکہ تابعین اپنے دور میں اس انداز سے پھیل چکے تھے کہ ان میں موافق یا مخالف کی پہچان کرنا ممکن نہیں، لیکن تابعی کا قول بعد والوں کے اقوال سے بہتر ہے، کیونکہ: (1) وہ خیر القرون سے ہیں۔ (2) ان کے معلم صحابہ کرام ہیں۔ (3) عربی لغت سے بھی وہ نسبتاً بہتر واقف ہیں، خصوصاً: مجاہد، عکرمہ، سعید بن المسیب، سعید بن جبیر، عطاء بن ابی رباح، حسن بصری، ابوالعالیہ اور قتادہ جیسے تابعین، جن کے اقوال سے تفاسیر بھری پڑی ہیں۔

تفسیر صحابہ وتابعین کے بارے بعض اہم اصول:

1- احادیث نبویہ کی طرح تفسیرِ صحابہ وتابعین کی اسانید کی تحقیق انتہائی ضروری ہے، کیونکہ قبول یا عدم قبول کا مدار ان آثار کی صحت وضعف پر ہے۔
2- جس طرح آیات واحادیث کی تفسیر کے لیے ضروری ہے کہ کسی موضوع سے متعلقہ تمام آیات واحادیث جمع کرنے کے بعد ہی ان کا صحیح مفہوم اور مقصد واضح ہوتا ہے، ایسے ہی صحابہ وتابعین سے منقول تفاسیر کے تمام طرق والفاظ جمع کرنا ضروری ہے۔
3- صحابہ وتابعین کے اقوال میں بعض اوقات اختلاف ہوتا ہے، بلکہ خود ایک صحابی یا تابعی کے اپنے اقوال بھی متضاد ہو سکتے ہیں، اس صورت میں اگر تطبیق ممکن نہ ہو تو ترجیح کا پہلو اختیار کیا جائے گا۔
4- صحابہ وتابعین کا تفسیری منہج جاننے کی ضرورت ہے، اور وہ یہ کہ اکثر وبیشتر کوئی صحابی یا تابعی کسی آیت کی تفسیر کا ایک معنی بیان کرنے پر اکتفاء کرتا ہے، جبکہ دوسرا شخص اس کا دوسرا معنی بیان کرتا ہے، اور دونوں معانی ہی برحق ہوتے ہیں، جسے اختلاف تنوع کہا جاتا ہے۔
5- منہج التفسیر بالماثور کے مطابق صحابہ وتابعین کے ثابت شدہ راجح اقوال کے مقابلہ میں کوئی نیا قول اختیار کرنا جائز نہیں، جس کی بنیاد کسی صحیح دلیل پر نہ ہو۔
6- صحابہ وتابعین کی تفاسیر سے بڑھ کر مزید فوائد واحکام اخذ کیے جا سکتے ہیں جو تفسیر بالماثور کے اصول وضوابط کے مطابق ہوں، کیونکہ قرآن کے عجائبات لامتناہی ہیں، اور اس میں تفکر وتدبّر کی راہیں کشادہ ہیں۔

اللغۃ العربیۃ سے تفسیرِ القرآن کے اصول و ضوابط

قرآن کریم بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِيْن میں نازل ہوا ہے، اس لیے عربی زبان کے مفردات، اسالیب، تعبیرات اور معانی سے آگہی کے بغیر تفسیرِ قرآن نہ ممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ وتابعین تفسیر میں عربی زبان وادب سے خوب استفادہ کرتے ہوئے جابجا اشعارِ عرب سے شواہد پیش کرتے، امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اگر میرے پاس ایسا شخص لایا جائے جو عربی لغت کی معرفت کے بغیر تفسیر کرتا ہو تو میں اسے ایسی سزا دوں گا جس سے نشانِ عبرت بن جائے". (تفسير البسيط، الواحدي 21/1).

عربی لغت سے تفسیر کے اصول و قواعد:

1- قرآن کریم افصح الکلام اور عربوں کے معروف معانی کے مطابق نازل ہوا ہے، اس لیے اس کی تفسیر میں یہی فصیح ومعروف معانی مراد لیے جائیں، شاذ اور قلیل استعمالات سے گریز کیا جائے، جیساکہ ارشادِ باری تعالی: ﴿**لا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلا شَرَابًا**﴾ میں (**بَرْدًا**) سے بعض علماء نے کلامِ عرب استشہاد کرتے ہوئے نیند مراد لی ہے، لیکن ابن جریر طبری فرماتے ہیں: یہ لفظ (**بَرْدًا**) نیند کے لیے غیر معروف ہے.

2- قرآن کریم کی لغوی تفسیر کرتے ہوئے صحابہ وتابعین کی لغت سے رجوع کیا جائے، کیونکہ وہ اکثر وبیشتر خالص عربی النسل تھے، اور وہ عربی لغت کے دورِ احتجاج میں زندگی بسر کرنے والے خود اہلِ زبان تھے. جب ہر خالص عربی کا بولا ہوا لفظ قابلِ حجت تھا، اس لیے ان کی تشریحات بعد میں آنے والے لغت کے ماہرین سے بہتر ہیں، جس کی مثال لغت کے ایک امام ابو عبیدہ کی تفسیر ہے، وہ معرکۂ بدر کی رات نازل ہونے والی بارش کے فوائد: ﴿وَيُثَبِّتُ بِهِ الأَقْدَام﴾ میں لکھتے ہیں: "يُفْرِغُ لَهُمُ الصَّبْرَ وَيُنْزِلُهُ عَلَيْهِم ... "، "ان پر صبر ڈالتا اور نازل کرتا ہے"، ابن جریر طبری اس تفسیر پر تبصرہ کرتے ہیں کہ ان کا یہ قول تمام صحابہ وتابعین کی تفسیر کے خلاف ہے، جنہوں نے اس کا معنی کیا ہے: ریت گیلی ہو جانے سے مومنوں اور ان کی سواریوں کے قدموں کا جما دیا جانا ہے.

3- سابقہ مثال سے یہ اصول بھی واضح ہوا کہ تفسیرِ صحابہ وتابعین کے مخالف لغوی تفسیر مردود ہے، اسی لیے تفسیر بالماثور کا قاعدہ ہے: (**فَهْمُ السَّلَفِ لِلْقُرانِ حُجَّةٌ يُحْتَكَمُ إِلَيْهِ لاَ عَلَيْهِ**) سلف کا فہمِ قرآن حجت ہے، اس سے فیصلہ لیا جائے گا، نہ کہ اس کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا.

4- تفسیرِ قرآن قدیم عرب أُمِّيِّيْن کے ہاں معروف معانی کے مطابق ہونا چاہیے، نہ کہ فلسفہ ومنطق، اور سائنس وٹیکنالوجی کی ایجادات کی جدید اصطلاحات کے مطابق، قرآن کریم سے مزید فوائد ومعارف تو حاصل کیے جا سکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ تفسیرِ قرآن کے نبوی، اور صحابہ وتابعین کے منہج کے خلاف نہ ہو، اور کوئی شک نہیں کہ فلسفہ ومنطق سلف صالحین کا منہج نہیں ہے، قواعدِ تفسیر میں سے ہے: (تُحْمَلُ نُصُوْصُ الْكِتَابِ عَلَى مَعْهُوْدِ الأُمِّيِّيْن فِي الْخِطَاب) "کتاب اللہ کی عبارتیں

عرب اُمِّيِّيْن کے ہاں معروف معانی پر محمول کی جائیں"، اسی طرح یہ بھی قاعدہ ہے: "لَا يَجُوْزُ حَمْلُ الكِتَابِ عَلَى اصْطِلَاحٍ حَادِثٍ" "کتاب اللہ کو کسی جدید اصطلاح پر محمول نہیں کیا جائے گا".

5- قرآن کریم کی لغوی تفسیر کرتے ہوئے شرعی معنی کو مقدم رکھا جائے: شرعی معنی سے مراد وہ الفاظ ہیں جنہیں شریعت نے خاص معنی دیا ہے، جیسا کہ لغت میں زکاۃ کسی بھی نشوونما، اور صوم: رک جانے کا، اور حج: قصد کرنے کا معنی دیتے ہیں، لیکن شریعت نے ان کو خاص اصطلاحی معانی دیے ہیں، لہٰذا شریعت کے معانی سے بے نیاز رہ کر محض لغت سے ان کا معنی متعین کرنا غلط ہے.

تفسیر القرآن بأسباب النزول

قرآنِ کریم جو کہ انسانیت کی رشد وہدایت کے لیے نازل ہوا ہے، اس کا بہت سا حصہ تو اللہ تعالی کی طرف سے ابتداءً محض ہدایت کے لیے نازل کیا گیا ہے، جبکہ قرآن کا کچھ حصہ ایسا ہے جو عہد رسالت کے حالات وواقعات سے تعلق رکھتا ہے، چنانچہ قرآن کریم سے حقیقی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ان واقعات کو جاننا ضروری ہے، جو ان آیات کے پسِ منظر میں کارفرما ہوں. لہٰذا اصولِ تفسیر میں اسباب النزول کی ایک خاص اہمیت ہے، جس پر علماء کی مستقل تصنیفات ہیں، جیسا کہ أسباب النزول للواحدي، العُجاب في بيان الأسباب لابن حجر اور لباب النقول في أسباب النزول لسيوطي ہے.

اسباب النزول کی تعریف:

کسی واقعہ کی وجہ سے یا اس واقعہ کے موقعہ پر کوئی آیت یا آیات نازل ہوں، اور ان میں واقعہ کا حکم بیان ہوا ہو، یا اسے زیرِ بحث لایا گیا ہو، اسے سبب النزول کہتے ہیں.

تفسیر قرآن میں اسباب النزول کی اہمیت:

تفسیر قرآن میں اسباب النزول کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ اس واقعہ کی معرفت، اور اس کی تفصیلات کے علم سے آیت کے مفہوم اور اس کی غرض وغایت تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے، اور اس کا معنی متعین کرنے میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے. اگرچہ بعض لوگ اس میں افراط وتفریط کا شکار ہوئے ہیں، کہ کسی نے تو اسباب النزول کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی، اور اس کے برخلاف بعض دوسرے لوگوں نے ہر آیت کا کوئی سببِ نزول تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، چاہے کوئی جھوٹا واقعہ یا ضعیف ومنکر روایت ہی کیوں نہ ہو.

لیکن بلاشبہ منہج التفسیر بالماثور میں اسباب نزول ایک مسلّمہ اصول کی حیثیت رکھتے ہے. امام شاطبي اسباب نزول کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ کتاب الٰہی کے فہم میں اہم حیثیت رکھتے ہیں، ان کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، سبب نزول کی پہچان کا مطلب: صورتِ حال کے تقاضوں کو پہچاننا ہے.

مزید یہ کہ سبب نزول کی عدمِ معرفت کئی قسم کے شبہات واشکالات پیدا کر سکتی ہے، اور پھر یہی چیز امت میں اختلاف کا باعث بن سکتی ہے، جیسا کہ ابن عباس نے عمر رضی اللہ عنہم سے فرمایا: "امیر المؤمنین! قرآن ہمارے درمیان اترا، ہم نے اسے پڑھا، اور جس صورتِ حال میں اترا اسے سمجھا، ہمارے بعد آنے والے کئی لوگ قرآن پڑھیں گے، لیکن اسباب نزول نہ جاننے کی وجہ سے ہر ایک اپنی

رائے کا اظہار کرے گا، اور جب ان کی رائے مختلف ہوں گی تو آپس میں لڑیں گے . . . . "، اور خوارج کے فتنہ کی بنیاد یہی تو ہے، جنہوں نے ان آیات کو جو کفار کے متعلق نازل ہوئیں انہیں مسلمانوں پر چسپاں کر کے ان کے جان ومال حلال کر دیے .

اہمیت کے لحاظ سے اسباب نزول کی اقسام:

1- وہ اسباب نزول جو بذاتِ خود مقصود ہیں، جنہیں پہچانے بغیر ان آیات کی تفسیر ممکن ہی نہیں، جیسا کہ واقعہءِ اِفک ، غزوہ بدر، واحد، وحنین وغیرہ ہیں، ان واقعات کا پسِ منظر اور تفصیلات کسی مفسر کے ذہن میں نہ ہوں تو ان سے متعلقہ آیات کی صحیح تفسیر ممکن نہیں.

2- کچھ اسباب نزول وہ ہیں جن کی طرف قرآن کریم نے شرط واقعی کے طور پر واضح اشارہ کیا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ (صفا ومروہ اللہ تعالی کی نشانیوں میں سے ہیں، پس جو بیت اللہ حج یا عمرہ کرے اسے ان کا طواف کر لینے میں کوئی گناہ نہیں. . .) (البقرة: 158)، (فَلا جُنَاحَ) (کوئی گناہ نہیں) سے بعض صحابہ کو شبہہ ہوا کہ صفا ومروہ کی سعی کرنا ضروری نہیں، لیکن اُم المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے سبب نزول بیان کر کے واضح کیا کہ لوگ جاہلیت میں مناۃ بت سے احرام باندھتے اور صفا ومروۃ کی سعی نہ کرتے، تو اسلام لانے کے بعد بھی انہوں نے صفا ومروہ کی سعی کرنے میں حرج محسوس کیا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی. (البخاري: 1643،مسلم: 4495) .

3- عہدِ نبوی میں بعض ایسے واقعات پیش آئے جن کے متعلق احکام نازل ہوئے ، اگرچہ آیات کی تفسیر میں ان اسباب کی بنیادی حیثیت نہیں، لیکن مفسرین نے ان آیات کی تفسیر کے تحت ان کا ذکر کیا ہے، جس سے آیت کے فہم میں اضافہ ہوتا ہے، جیسا کہ کعب بن عُجرہ کو سر میں تکلیف کی وجہ سے حالتِ احرام میں بال کٹوانے کا حکم دیا جانا ہے: ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ﴾ (لہٰذا تم میں جو بیمار ہو یا اس کے سر میں کسی طرح کی اذیت ہو تو وہ: روزے، صدقہ یا قربانی سے فدیہ ادا کرے) (البقرة: 196) .

4- بعض مفسرین ایسے اسباب النزول کا تذکرہ کرتے ہیں جو حقیقت میں اسباب النزول نہیں، بلکہ وہ ان آیات کی مثالیں اور عملی نمونہ ہیں، جیسا کہ نیک لوگ اور ان کی صفاتِ حمیدہ کا بیان، یا بعض بد بخت لوگ اور ان کی صفاتِ مذمومہ کا بیان، تو اس طرح کی آیات میں اعمال صالحہ کے عاملین کی تعریف، یا اعمال بد کے عاملین کی تحقیر مراد ہوتی ہے، نہ کہ کسی شخص کی تعیین کرنا.

5- جو اسباب النزول ضعیف اور موضوع روایات پر مبنی ہوں، جیسا کہ ابن اسحاق، واقدی اور کلبی وغیرہ نے ہر آیت کے تحت کوئی قصہ وغیرہ ذکر کیا ہے، تو اس طرح کے اسباب النزول کا تفسیر سے کوئی تعلق نہیں.

اسباب النزول کے فوائد:

1- **شانِ نزول سے حکمت کی تعیین** ہوتی ہے: جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ﴾ (اے ایمان والو ! نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ) (النساء: 43) ، جس میں اشکال پیدا ہوتی ہے کہ جب شراب حرام ہے تو پھر نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ آنے کا کیا معنی، شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم شراب کی کلی حرمت سے قبل ہے.

2- **شانِ نزول سے معنیٰ کی وضاحت**: جیساکہ ارشاد ہے: ﴿وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ﴾ (مشرق و مغرب اللہ تعالی کے لیے ہیں، تم جس طرف رخ کرو سو وہیں اللہ کا چہرہ ہے) (البقرة:115)، شانِ نزول جانے بغیر آیت کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں کسی طرف رخ کرنا ضروری نہیں ہے، جبکہ اس آیت کا نزول یہودیوں کے اعتراض کے جواب میں ہے.

3- **شانِ نزول سے حقیقت کی تعیین**: جیساکہ ارشاد ہے: ﴿فَإِذا قَضَيْتُمْ مَناسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آباءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْراً﴾ (جب تم حج کے اعمال مکمل کر لو تو اللہ کا ذکر کرو جس طرح تم اپنے آباء واجداد کا ذکر کرتے ہو) (البقرة: 200) ، شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت میں لوگ حج کے اعمال سے فارغ ہو کر اپنے آباء واجداد کے تذکرے کرتے تھے، تو اس پر حکم نازل ہوا کہ اس کی بجائے اللہ کا ذکر کرو.

4- **شانِ نزول سے واقعہ کی وضاحت**: جیساکہ ارشاد ہے: ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى﴾ (جب آپ نے پھینکا تھا تو آپ نہیں پھینکا بلکہ اللہ تعالی نے پھینکا) (سورة الانفال: 17)، جس میں غزوہ بدر میں رسول اللہ ﷺ کا کفار پر مٹھی بھر مٹی پھینکنے کا بیان ہے.

5- **اس حقیقت کا بیان کہ قرآن کریم اللہ تعالی کی طرف سے نازل شدہ ہے،** کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے کوئی سوال کیا جاتا، اور آپ اس پر توقف فرماتے، یہاں تک کہ وحی نازل ہوتی اور آپ اس کا جواب دیتے، جیساکہ: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي﴾ (اور آپ سے روح کے بارے سوال کرتے ہیں، تو کہہ دیجیے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے) (الاسراء: 85) میں یہودی کے سوال کرنے پر یہ آیت نازل ہوئی.

6- **رسول اللہ ﷺ پر بعض مخفی امور کی وضاحت**: جیساکہ منافقین کے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کے خلاف بکواس کرنے کے انکار کرنے پر یہ آیات نازل ہوئیں: ﴿يَقُولُونَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الأَعَزُّ مِنْهَا الأَذَلَّ﴾ (کہتے ہیں: جب ہم مدینہ لوٹیں گے تو ہم میں عزت والا ذلیل کو وہاں سے نکالے گا) (المنافقون: 8).

7- **اللہ تعالی کی بندوں پر عنایت اور فضل وانعام**: جیساکہ پانی نہ ملنے پر آیت تیمّم کا نزول ہوتا ہے.

8- **آیت کا صحیح فہم وادراک حاصل ہونا**: جیساکہ ﴿ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ (صفا و مروہ اللہ تعالی کی نشانیوں میں سے ہیں، پس جو بیت اللہ حج یا عمرہ کرے اسے ان کا طواف کر لینے میں کوئی گناہ نہیں...) (البقرة: 158)، (فَلا جُنَاحَ) (کوئی گناہ نہیں) سے بعض صحابہ کو شبہ ہوا کہ صفا و مروہ کی سعی کرنا ضروری نہیں، لیکن سبب نزول سے واضح ہوا کہ لوگ جاہلیت میں مناۃ بت سے احرام باندھتے اور صفا و مروۃ کی سعی نہ کرتے، تو اسلام لانے کے بعد بھی انہوں نے صفا و مروہ کی سعی کرنے میں حرج محسوس کیا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی. (البخاري: 1643، مسلم: 4495).

اسباب النزول کا اہم اصول:

عُمُومُ اللَّفْظِ وَخُصُوصُ السَّبَب: یعنی اگر آیت کسی خاص سبب کے پیشِ نظر نازل ہو، جبکہ اس کا لفظ عام ہو، تو اس کا حکم اس سبب کے ساتھ خاص نہیں ہوگا، بلکہ لفظ کے عموم کے لحاظ سے ہر زمان و مکان کے لیے عام وشامل ہوگا، کیونکہ قرآن کریم تمام امت کی رہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے، لہٰذا قاعدہ یہ ہے: (العِبْرَةُ بِعُمُومُ اللَّفْظِ لَا بِخُصُوصُ السَّبَب).

التفسیر بالماثور میں اسرائیلیات کی حیثیت

اسرائیلیات کا معنی و مفہوم:

انبیاء سابقین کے احوال، اور ان کی قوموں کے واقعات، ان کی ثقافت اور معاملات جو کتب سابقہ میں بیان ہوئے، یا اہلِ کتاب نے ان کا تذکرہ کیا، اس طرح کی روایات کو اسرائیلیات کا نام دیا جاتا ہے، چنانچہ قرآن کریم کا بہت بڑا حصہ مذکورہ موضوعات پر مشتمل ہے، اور ممکن ہے جن چیزوں کو قرآن میں مجملاً بیان کیا گیا ہے، اسرائیلیات میں ان کا مفصل بیان ہو، لیکن چونکہ یہود ونصاری نے توراۃ وانجیل میں تحریف کی ہے، اور بہت سے حقائق میں غلط بیانی کی ہے، اس لیے اکثر وبیشتر صحابہ وتابعین نے اسرائیلیات سے توقف سے کام لیا ہے، جیساکہ نبی کریم ﷺ نے اس کی تعلیم دی ہے: (لا تُصَدِّقُوا أهْلَ الكِتَابِ ولا تُكَذِّبُوهُمْ) (اہل کتاب کی تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب) (البخاري: 4485).

لیکن اگر یہ روایات عقائد واحکام سے متعلق نہ ہوں، اور اسلام کے بنیادی اصولوں کے منافی نہ ہوں تو انہیں روایت کرنے کی اجازت دی گئی ہے: (وَحَدِّثُوا عن بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ) (بنی اِسرائیل سے بیان کر لیا کرو، کوئی حرج نہیں) (البخاري: 3461)، جس وجہ سے صحابہ کے بعد سے کتب تفسیر میں اسرائیلیات بکثرت روایت کی گئیں، علماء کی تحقیق کے بعد ان اسرئیلی روایات کی تین اقسام حسب ذیل ہیں:

اسرائیلیات کی اقسام:

1- ایسی روایات جن کے مضامین کی صحت وسچائی قرآن وسنت سے ثابت ہے، جیسے توحید ورسالتِ محمدی کی تصدیق کرنے والی روایات، ایسی روایات کو بطور تائید واستشہاد نقل کیا جائے گا، نہ کہ بطور دلیل، کیونکہ قرآن وسنت کی موجودگی میں کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں.

2- وہ روایات جن کے مضامین کا بطلان اور کذب قرآن وسنت سے ثابت ہے، اور واضح طور پر قرآن وسنت کے مخالف ہیں، جیساکہ الوہیت، شانِ رسالت، عصمت انبیاء وغیرہ کے خلاف اِسرائیلی خرافات ہیں، ایسی روایات کا نقل کرنا صرف ان کی تکذیب وتردید کے لیے جائز ہے، بلاتردید وتکذیب ان کا نقل کرنا جائز نہیں، کیونکہ اس سے باطل عقائد واخبار کی ترویج ہوتی ہے.

3- تیسری قسم وہ ہے جن کی قرآن وسنت میں نہ تصدیق نہ تکذیب ہے، ایسی روایات میں توقف کرنا چاہیے، کیونکہ کسی آیت کی تفسیر میں ان کا تذکرہ کیا جانے میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ روایات قرآن کی وضاحت اور اس کی تفصیل پیش کر رہی ہیں، اور اس سے بڑھ تصدیق کیا ہوگی کہ انہیں قرآن کی تفسیر کا درجہ دے دیا جائے، جبکہ ہمیں ان کی تصدیق کرنے سے منع کیا گیا ہے.

تفسیر القرآن بالرای

قرآن کریم اپنی آیات مبارکہ میں غور و فکر اور عقل و اجتہاد کی دعوت اور ترغیب دیتا ہے، جس طرح آیاتِ کونیہ (اللہ کی مخلوقات) میں غور و فکر اور تحقیق سے اللہ کی عظمت کے پہلو سامنے آتے ہیں، اسی طرح آیاتِ قرآنیہ میں تدبر و تفکّر سے شریعتِ اسلامیہ اور کلامِ الٰہی کے علوم و معارف حاصل ہوتے ہیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کے لیے سوچ و فکر اور عقل و رائے سے کام لینے کی ضرورت ہے، لیکن تفسیرِ قرآن میں اس عقل و فکر کی کیا حدود ہیں، اور اس کا کیا ضابطہ ہے؟ یہاں اس موضوع پر بحث کی جائے گی.

رائے کا لغوی مفہوم:

لغوی طور پر "الرَّأْيُ" باب رَآی یَرَی سے مصدر ہے، **فیروز آبادی** لکھتے ہیں: الرُؤيَة: النَّظَرُ بِالْعَينِ وَالْقَلْب. آنکھ اور دل سے کسی چیز کو دیکھنا رؤیت کہلاتا ہے. پھر فرماتے ہیں: عقیدہ و نظریہ کو رائے کہتے ہیں. چنانچہ اس لفظ کے معانی: مشاہدہ، غور و فکر، نظریہ و عقیدہ ہیں.

اصطلاحی طور پر: عقل و اجتہاد اور غور و فکر کے ذریعہ سے مطالبِ قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرنا، اور انہیں واضح کرنا **تفسیر بالرأي** ہے.

تفسیر بالرأي کی اقسام:

اس کی دو بڑی قسمیں ہیں:

(1) **تفسير بالرأي المحمود** (اچھی رائے سے تفسیر):

اگر تفسیری آراء و اجتہاد کتاب و سنت، آثارِ سلف، کلامِ عرب کے اسالیب کے مطابق اور تفسیر بالرأي کی شروط و آداب کے موافق ہوں تو یہ تفسیر بالرأي المحمود ہے.

(2) **تفسير بالرأي المذموم** (غلط رائے سے تفسیر):

اگر تفسیر کتاب و سنت، آثار سلف، اور قوانین لغت اور شروط و آداب کے منافی ہوں تو یہ تفسیر بالرأي المذموم ہے، جس کے حرام ہونے پر علماء کا اجماع ہے.

تفسير بالرأي المحمود کے دلائل:

1- قرآن کریم میں: کلامِ الٰہی میں غور و فکر کی دعوت:

قرآن کریم میں غور و فکر کرنے سے نئے حقائق، مضامین اور اسرار و حکم معلوم ہوتے ہیں، اسی لیے آیاتِ قرآنیہ ان معانی اسرار کی تلاش اور ان میں غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں: ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ﴾ (ہم نے آپ پر ایک مبارک کتاب نازل کی ہے، تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور و فکر کریں)، مزید فرمان ہے: ﴿أَفَلا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾ (بھلا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے (قفل) لگ گئے ہیں)، مزید ارشاد

ہے: ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ﴾ "ہم نے یہ ذکر (قرآن) تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے لیے اُس کی تشریح وتوضیح کرتے جاؤ جو اُن کے لیے اتارا گیا ہے، اور تاکہ لوگ (خود بھی) غور وفکر کریں﴾ (النحل: 44).

2- احادیثِ رسول میں قرآن میں غور وفکر کی دعوت:

نبی کریم ﷺ نے مختلف انداز سے قرآن کریم میں غور وفکر کی ترغیب دلائی ہے، فرمانِ نبوی ہے: (مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللَّهِ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَيَتَدَارَسُونَهُ بَيْنَهُمْ إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِينَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللَّهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ) (جب بھی کچھ لوگ اللہ کے کسی گھر میں جمع ہو کر اللہ کی کتاب پڑھتے اور باہم اس کا مذاکرہ کرتے ہیں: ان پر اللہ تعالی کی طرف سے تسکین اور رحمت اترتی ہے، فرشتے انہیں ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں، اور اللہ تعالی اپنے مقربین کے ہاں ان تذکرہ فرماتا ہے) (مسلم)

3- صحابہ کرام کا قرآن کریم میں اجتہاد وتدبر:

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (كُنَّا لَا نَتَجَاوَزُ عَشْرَ آيَاتٍ حَتَّى نَتَعَلَّمَهُنَّ وَنَعْمَلَ بِهِنَّ، وَنُعَلِّمَهُنَّ، وَنَعْلَمَ حَلَالَهُنَّ وَحَرَامَهُنَّ، فَأُوتِينَا العِلْمَ وَالعَمَلَ) (ہم دس آیتوں سے آگے نہ بڑھتے جب تک انہیں سیکھ کر، ان پر عمل پیرا ہو کر، انہیں دوسروں کو سکھا کر، ان میں بیان شدہ حلال وحرام کا علم نہ حاصل کر لیتے، اس طرح سے ہمیں علم وعمل حاصل ہوا) (البيان لابي عمرو الداني)، اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مسلسل آٹھ برس تک سورۃ البقرہ پر تدبر فرماتے رہے. (مؤطا مالك)

4- تابعین کا تفسیرِ قرآن میں رائے واجتہاد:

اس باب میں امام مجاہد سابقین میں نظر آتے ہیں، بلکہ کہا جاتا ہے کہ امام مجاہد نے تفسیر بالماثور میں عقل واجتہاد کا دروازہ کھولا . اور فرماتے: "اَفْضَلُ الْعِبَادَةِ الرَّأْيُ الْحَسَنُ" بہتر طریقہ سے غور وفکر بہترین عبادت ہے (تاويل مختلف الحديث لابن قتيبه : 69)، ابن تیمیہ رحمہ اللہ تابعین کے بارے فرماتے ہیں: "وإن كانوا يتكلمون في بعض ذلك بالاستنباط والاستدلال كما يتكلمون في بعض السنن ..." وہ (تابعین) احکام ومسائل میں استنباط واستدلال کی طرح بعض اوقات تفسیر میں بھی استنباط واستدلال سے کام لیتے تھے" (مقدمه في اصول التفسير : 7-8).

تفسیر بالرأي المذموم کے متعلق دلائل وفرمودات:

1- احادیث میں رائے کی مذمت:

ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ) (جس نے قرآن کریم میں اپنی رائے سے کام لیا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے) (الترمذي: 2950) وقال: حديث حسن صحيح.

جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (مَن قَالَ فِي القُرآنِ برأيِه فأَصَابَ فَقَد أَخْطَأَ) (جس نے قرآن میں رائے سے کام لیتے ہوئے کوئی بات کی، اگرچہ درست بھی کہا تو بھی اس نے غلطی کی) (سنن ابي داود 3652، الترمذي: 2950 وقال : هذا حديث غريب...)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (إِنَّ اللَّهَ لا يَقْبِضُ العِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ العِبَادِ، ولَكِنْ يَقْبِضُ العِلْمَ بقَبْضِ العُلَمَاءِ، حتَّى إذَا لَمْ يُبْقِ عَالِمًا اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُوسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوا فأفْتَوْا بغيرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوا وأَضَلُّو) (اللہ تعالی علم کو انسانوں سے اچانک نہیں اٹھائے گا، بلکہ علماء فوت ہو جائیں گے، ان کے جانے سے علم بھی رخصت ہو جائے گا، اور لوگوں میں جاہل پیشوا باقی رہ جائیں گے، وہ بغیر علم کے فتوی دیں کر خود گمراہ ہوں گے، اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے. (البخاري: 100، مسلم: 6273)، دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: (فَيُفْتُونَ بِرَأْيِهِمْ فَيَضِلُّونَ وَيُضِلُّونَ) (وہ اپنی رائے سے فتوی جاری کرکے خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے) (البخاري : 100، 7307، مسلم: 6273).

2- صحابہ کرام اور رائے کی مذمت:

ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ﴿وَفَاكِهَةً وَأَبًّا﴾ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: (أَيُّ سَمَاءٍ تُظِلُّنِي وَأَيُّ أَرْضٍ تُقِلُّنِي إذَا قُلْتُ فِي كتابِ اللهِ مَا لا اَعلَم) (اگر میں اللہ کی کتاب میں ایسی بات کہہ دوں جس کا علم نہیں تو مجھے کونسا آسمان اپنے نیچے اور کونسی زمین اپنے اوپر جگہ دے گی) (سنن سعید بن منصور (39)، مصنف ابن ابي شيبه (10152)، فتح الباري (271/13)، وحسن اسناده الشيخ مشهور حسن.
اسی طرح عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ رائے کے بارے فرماتے ہیں: (لوگو! بیشک صحیح رائے تو صرف رسول اللہ ﷺ ہی کی تھی، کیونکہ انہیں اللہ تعالی کی راہنمائی حاصل تھی، جبکہ ہماری رائے تو محض ظن و تکلف ہی ہے) (جامع بيان العلم، ابن عبدالبر 200).
ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک آیت کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے اس کے متعلق کچھ کہنے سے انکار کر دیا. (الطبري ، ابن كثير نے اس كي سند كو صحيح قرار ديا هے، تفسير ابن كثير 28/1)

3- تابعین عظام سے رائے کی مذمت:

خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تحریری حکم نامہ جاری کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (إِنَّهُ لَا رَأْيَ لِاَحَدٍ مَعْ سُنَّةٍ سَنَّهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ) (بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے ہوتے ہوئے کسی کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں) (جامع بيان العلم ص(781) ح(1456)، سید التابعین سعید بن المسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (إِنَّا لَا نَقُولُ فِي الْقُرْآنِ شَيْئاً) (ہم تفسیر قرآن کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتے)، اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے شاگردِ رشید: قتادۃ بن دعامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (مَا قُلْتُ بِرَأْيِيْ مُنْذُ أَرْبَعِينَ سَنَة) (میں نے چالیس سے اپنی رائے سے کوئی بات نہیں کی) (سنن الدارمي 47/1)، ان کے علاوہ بھی متعدد تابعین سے رائے کی مذمت میں اقوال منقول ہیں.
شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ صحابہ وتابعین کے ان اقوال کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ صحیح آثار اور ائمہ کرام کے دیگر اقوال اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ لوگ بغیر علم کے تفسیر میں کلام کرنا گناہ سمجھتے تھے، اور اس سے بچتے تھے، لیکن جو شخص تفسیر میں لغت اور شرعی علم کی بنیاد پر بات کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، چنانچہ جہاں تک انہیں قرآن وسنت کے دلائل کا علم تھا انہوں نے تفسیر کی، اور جس چیز کا علم نہیں تھا اس میں سکوت اختیار کیا. (بتصرف:مقدمه في اصول التفسير : ص(55).

ابن تیمیہ رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: "جس شخص نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی تو اس نے ایسی بات کا تکلف کیا جس کا اسے علم نہیں، اور ایسا راستہ اختیار کیا جس کا اسے حکم نہیں ہے، اگرچہ اس نے صحیح معنی کیا ہو تب بھی اس نے غلطی کی، کیونکہ اس نے علم کا صحیح راستہ اختیار نہیں کیا، اس شخص کی طرح جو جہالت سے لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہو، اگرچہ اس نے صحیح فیصلہ بھی کر دیا ہو تب بھی وہ جہنم میں ہے" (الفتاوى: 371/13).

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر القرآن بالرای کے دو بڑے انداز رہے ہیں:

1- فہمِ قرآن میں احادیث وآثار، اقوالِ سلف اور عربی لغت کے پیشِ نظر عقل واجتہاد اور غور وفکر سے کام لینا، جسے تفسیر بالرأي المحمود کہا جاتا ہے. اگرچہ اس میں بہت حزم واحتیاط کی ضرورت ہے، تاکہ اللہ کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ کی جائے.
2- احادیث وآثار اور اقوالِ سلف کو نظر انداز کرکے محض عربی لغت پر اعتماد کرتے ہوئے، یا محض نظریات وخواہشات کی تائید میں تفسیر کرنا، جو تفسیر بالرأي المذموم ہے.

کیونکہ بغیر صحیح شرعی علم اور مضبوط بنیادوں کے اللہ کی طرف کوئی چیز منسوب کرنا بہت بڑا گناہ ہے، اللہ تعالی نے حرام شدہ چیزیں بیان فرماتے ہوئے جہاں شرک کا ذکر کیا اس کے ساتھ ہی فرمایا: ﴿وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ (اور یہ کہ تم اللہ کے متعلق ایسی بات کہو جس کا تمہیں علم نہیں ہے) (الأعراف:33).

تفسیر بالرأي المحمود کے لیے ضروری شروط:

علوم القرآن کے ماہرین اہلِ علم نے ان شروط پر مفصل روشنی ڈالی ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے:

1- عقیدہ ومنہج کی صحت وسلامتی:

علامہ سیوطی فرماتے ہیں: "جو شخص دینی لحاظ سے معیوب ومکذوب ہو، اس پر تو دنیاوی معاملات میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا، چہ جائے دینی امور میں، بلکہ ایسا شخص تو اگر کسی عالم کے حوالے سے کوئی خبر دے تو قابل اعتبار نہیں ہوگا، اَسرارِ الہی کی خبر رسانی میں اس پر کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے" (الاتقان ص(854).

2- بااعتماد اور صحیح احادیث وآثار پر اعتماد:

تفسیر بالرأي المحمود کے لیے ضروری ہے کہ مفسر کا اعتماد صحیح احادیث وآثار پر ہو، چنانچہ ایسا کوئی قول نہ اختیار کیا جائے جو احادیث وآثار کے خلاف ہو.

3- مقصد ونیت کی صحت وسلامتی:

اللہ تعالی کی طرف سے توفیق اسی کے شاملِ حال ہوتی ہے جس کی نیت خالص اور مقصد صحیح ہو، چنانچہ براہِ راست مرادِ الہی کی تفسیر وتشریح مقصد ہو، اور کسی طرح کے ذاتی اغراض ومقاصد سے بالاتر ہو کر صحیح معانی تک پہنچنا مقصود ہو، ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (جو لوگ ہماری طرف کوشش کرتے ہیں، ہم ضرور انہیں اپنے راستے دکھا دیتے ہیں) العنکبوت: 69).

علامہ زرکشی فرماتے ہیں: جان لیجیے ! جس شخص کے دل میں بدعت، تکبر، خواہشِ نفس، حب دنیا سمائی ہو، یا کسی گناہ پر مصر ہو، ایمان مشکوک ہو، یا کسی بے علم مفسر کے قول پر اعتماد کرنے والا ہو ... تو ایسے شخص کو وحی کا علم حاصل ہو سکتا ہے نہ وہ وحی کے اسرار پا سکتا ہے" (البرھان 180/2-181).

تفسیرِ قرآن کے لیے جن علوم وفنون کی ضرورت ہے:

مفسر قرآن کو تفسیر میں صرف احادیث وآثار پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ فکر وفہم اور عقل واجتہاد سے کام لیتے ہوئے قرآنی حقائق ومعارف میں غوطہ زن ہو کر نئے نئے گوہر تلاش کرنا چاہیے، خصوصاً دورِ حاضر کے تقاضوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے کلامِ الٰہی سے رہنمائی حاصل کرے.

علماءِ کرام نے مفسر کے لئے جن علوم کو ضروری قرار دیا ہے ان میں سے چند یہ ہیں:

(1) لغت کا علم۔ (2) نحو کا علم۔ (3) صَرف کا علم۔ (4) اشتقاق کا علم۔ (5،6،7) علوم البلاغہ: معانی، بیان اور بدیع کا علم۔ (8) قراءتوں کا علم۔ (9) توحید وایمان کا علم۔ (10) شرعی احکامات کا علم۔ (11) اصولِ فقہ کا علم۔ (12) اسبابِ نزول کا علم- (13) ناسخ اور منسوخ کا علم۔ (14) مُجمَل اور مُبہَم کی تفسیر پر مبنی احادیث کا علم۔ (15) علم مصطلح الحدیث (16)۔ افکار ومناہج کا علم۔ (17)۔ تاریخ ومغازی کا علم۔ (18) فرق ومذاہب کا علم۔ (19) اصولِ دین کا علم

اِن علوم کو سامنے رکھتے ہوئے اُن لوگوں کو اپنے طرزِ عمل پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے جو قرآن مجید کا صرف اردو ترجمہ اور تفاسیر کی اردو کتب پڑھ کر ترجمہ وتفسیر کرنا اور اس کے معانی ومطالب بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ بہت خطرناک اقدام ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص از خود میڈیکل کی کتابیں پڑھ کے اپنا کلینک کھول لے اور مریضوں کا علاج کرنا اور ان کے آپریشن کرنا شروع کر دے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ اس سے کہیں زیادہ نازک قرآنِ مجید کے ترجمہ وتفسیر کا معاملہ ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کے کلام کا معنی ومفہوم اور اس کی مراد بیان کرنا ہوتی ہے، چنانچہ اصولِ تفسیر کا علم حاصل کیے بغیر تفسیر کرنا بہت خطرناک عمل ہے، جو انسان کی تباہی اور گمراہی کا زینہ ہے۔ اس لئے تفسیر بیان کرنے سے پہلے باقاعدہ تفسیر کے بنیادی اصول معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔

حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عجمیوں کو اس بات نے ہلاک کر دیا کہ ان میں سے کوئی قرآنِ مجید کی آیت پڑھتا ہے، اور وہ اس کے معانی سے جاہل ہوتا ہے، تو وہ اپنی اس جہالت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ پر افتراء بازی شروع کر دیتا ہے۔ (البحر المحيط، الترغيب في تفسير القرآن، ١١٨/١)

اصولِ تفسیر کو نظرانداز کرنے کی صورتیں:

اصول تفسیر کو نظرانداز کرنے کی کئی صورتیں ہیں، مثلاً:

1۔ جو شخص تفسیر قرآن کے بارے میں گفتگو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، وہ محض اپنی رائے کے بل بوتے پر تفسیر شروع کر دے۔

2۔ کسی آیت کی کوئی تفسیر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ وتابعین سے ثابت ہو، وہ اسے نظرانداز کر کے محض اپنی عقل سے کوئی معنی بیان کرنے لگے۔

3۔ جن آیات میں صحابہ کرام وتابعین سے کوئی صریح تفسیر منقول نہیں ان میں لغت اور زبان وادب کے اصولوں کو پامال کر کے کوئی تشریح بیان کرے۔

4۔ قرآن وسنت سے براہ راست احکام و قوانین مستنبط کرنے کے لیے اجتہاد کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اور پھر بھی اجتہاد شروع کردے۔
5۔ قرآن کریم کے متشابہ آیات (جن کے بارے میں قرآن نے خود کہا کہ ان کی حقیقی اور صحیح مراد سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا) ان کی دوٹوک طور پر کوئی تفسیر بیان کرے اور اس پر مصر (بضد) ہو۔
6۔ قرآن کریم کی ایسی تفسیر بیان کرے جو اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہو.
7۔ تفسیر کے معاملہ میں جہاں عقل و فکر کا استعمال جائز ہے وہاں کسی قطعی دلیل کے بغیر اپنی ذاتی رائے کو یقینی طور پر درست اور دوسرے مجتہدین کی آراء کو یقینی طور سے باطل قرار دے۔
8. باطل آراء اور فاسد قیاس کو معیارِ کتاب وسنت ٹھہرا دے۔

یہ تمام صورتیں اس تفسیر بالرائے کی ہیں جن سے منع کیا گیا ہے، جیسا کہ ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (مَنْ أُفْتِيَ بِفُتْيَا غَيْرَ ثَبَتٍ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى مَنْ أَفْتَاهُ) "جسے بغیر تحقیق کے کوئی غلط فتویٰ دیا گیا، (اور اس نے اس پر عمل کیا) تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا" مسند احمد (321/2، 365) سنن الدارمي (161) (حسن)

سائنس اور تفسیر القرآن

سائنس اور جدید علوم کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر کے متعلق اہلِ علم کی تین رائے ہیں:

اس کی موافقت کرنے والے:

جن میں سر فہرست غزالی رحمہ اللہ (505ھ)، فخر الرازی (606ھ)، برہان الزرکشی (794ھ) اور علامہ سیوطی (911ھ) کے نام ہیں. غزالی فرماتے ہیں: "تمام علوم قرآن کریم سے اخذ کیے جاتے ہیں" (جواهر القرآن، الغزالي)، جبکہ فخر الرازی نے اس نظریہ کو اپنی تفسیر "مفاتیح الغیب" میں عملاً اختیار کیا ہے، اور علامہ زرکشی اور سیوطی نے ان کی تائید کی ہے (اتجاهات التفسير في القرن الرابع عشر، ڈاکٹر فهد الرومي 557/2-558).

اس رائے کے مخالفین:

سابقہ رائے کے برعکس دوسرے بعض علماء نے اس موقف کی تردید کی ہے، جن میں سر فہرست: امام شاطبي (790ھ)، ابوحیان اندلسی (745ھ) کے نام ہیں، اور جمہور مفسرین: الطبری، قرطبي، ابن کثیر وغیرہ نے اس موضوع کو کوئی اہمیت نہیں دی.

معتدل رائے:

جبکہ اس کے متعلق متوازن اور معتدل رائے یہ ہے کہ: قرآن کریم کی سائنسی تفسیر اور سائنسی اعجاز میں فرق کیا جائے.

قرآن کریم کا سائنسی اعجاز یہ ہے کہ قرآن نے: زمین آسمان، سورج چاند ستارے، کواکب وافلاک، نباتات وبحار وغیرہ کے بارے کئی حقائق پیش کیے ہیں، جن کا مقصد اللہ تعالی کی عظمت، اس کی توحید، اور اس کی نعمتوں کا بیان ہے، اور سائنسی تحقیقات ان حقائق کو مزید ثابت کرتی ہیں، اور سائنسی تاریخ میں کوئی ثابت شدہ تحقیق ان قرآنی حقائق کو غلط ثابت نہیں کرسکی.

جبکہ سائنسی تفسیر یہ ہے کہ کسی ایجاد، دریافت، نظریہ یا تجربہ وغیرہ کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ فلاں قرآنی آیت کا مدلول ہے، اور اس میں لوگ افراط و تفریط کا شکار ہیں، چنانچہ بعض تو ویسے ہی قرآن کریم کو سائنسی نظریات سے متعلق کرنے کے خلاف ہیں، جبکہ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو سائنسی ایجادات و نظریات کو قرآن کا ہدف ومقصد قرار دیے دیتے ہیں، جیسا کہ قرآن سائنس کی کتاب ہو.

سائنسی تحقیقات کی روشنی میں قرآن کریم کی تفسیر کے لیے شروط وضوابط :

1- قرآن کریم رب کائنات کا کلام ہے، اس کی تعلیمات وحقائق اپنی جگہ اٹل اور ناقابلِ تغییر ہیں، اس کے بر عکس سائنس جو نظریہ پیش کرتی ہے وہ محض تجربات ہیں، جو غیر اٹل اور تغیر پذیر ہیں، ہر سائنس دان دوسرے سائنس دان کے نظریے کی تردید کرتا ہے، چنانچہ ان سائنسی نظریات کو قرآن سے پرکھا جائے گا، نہ کہ قرآن ان سائنسی نظریات سے پرکھا جائے.

2- قرآن کریم کی صداقت وحقانیت کسی تائید کی محتاج نہیں ہے، رب العالمین کا یہ کلام تمام صداقتوں کا سرچشمہ ہے، چنانچہ اگر کسی سائنسی مشاہدہ میں قرآن سے مطابقت پائی جائے تو یہ نہیں کہا جائے گا اس سے قرآن کی تائید ہوتی ہے، بلکہ یہ کہا جائے کہ قرآن اس مشاہدہ یا تحقیق کی تائید کرتا ہے.

3- اگر قرآنی بیان اور سائنسی تجزیہ ومشاہدہ میں مطابقت نہ ہو تو قرآنی بیان کی تاویلیں کرنے کی بجائے انسانی مشاہدہ ونظریہ کو غلط قرار دیا جائے، اور یقین کر لیا جائے کہ اس نظریہ کی صحیح حقیقت تک پہنچنے کے لیے مزید تحقیق کی ضرورت ہے، ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ (کیا پیدا کرنے والا بہتر نہیں جانتا، جبکہ وہ خوب باریکی اور گہرائی سے خبر رکھتا ہے) (الملك:14).

4- کسی بھی جدید سائنسی نظریے یا مشاہدے کو قرآن کریم کا عین مدلول نہ قرار دیا جائے، کیونکہ اس سے نبی کریم ﷺ، صحابہ وتابعین اور سلفِ امت کے فہم پر حرف آتا ہے، کیونکہ اس معیار پر نبی کریم ﷺ اور صحابہ وتابعین کی زندگیاں قرآنی مضامین سے لاتعلق نظر آئیں گی.

5- اگر قرآن کریم نے کسی حقیقت کو بیان کیا ہو، اور وہ سلف صالحین کی تفسیر سے ثابت ہو، اور پھر جدید سائنس سے اسی تفسیر کے مطابق مزید حقائق معلوم ہو جائیں تو ایسی معلومات وتحقیقات کو تفسیرِ قرآن میں پیش کیا جا سکتا ہے.

وحی کا بیان

وحی کا معنی: وحی کے لغت میں کئی معانی ہیں، جن میں سے : الإشَارَة، والسُّرعَة، والإلْقَاءُفِي الرُّوْع، و إعْلامٌ في خَفَاء : یعنی: خفیہ اور جلدی سے اشارہ کرنا، اور دل میں بات ڈال دی جانا. (قال الشافعي: "الرَّوع (بالفتح) : الفَزَع، والرُّوع (بالضم): القلب" (آداب الشافعي ص(116).

اصطلاحی معنی: هُوَ كَلامُ اللهِ المُنَزَّلُ عَلَى نَبِيٍّ مِنْ اَنْبِيَائِه: وحی: اللہ کے کسی نبی پر اللہ تعالی کا نازل شدہ کلام. (فيض الباري 18/1).

قرآن کریم میں لفظ (وحی) 78 مرتبہ ذکر ہوا ہے.

وحی کی اقسام: شرعی احکام کے لحاظ سے وحی کی چار قسمیں ہیں:

1- **براہِ راست پسِ پردہ اللہ سے ہم کلام ہونا**: فرشتے کے واسطے کے بغیر، پردہ کے پیچھے سے، براہِ راست اللہ تعالی کا اپنے کسی نبی سے ہم کلام ہونا، جو کہ وحی کی تمام اقسام میں سے افضل ہے، موسی علیہ السلام کی اسی فضیلت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا﴾ (اور اللہ تعالی نے موسی سے حقیقی کلام کیا) (النساء: 164).

بعض لوگوں نے اللہ سے بغیر حجاب کے کلام کا بھی تذکرہ کیا ہے، لیکن یہ بات قرآن وسنت اور اجماعِ امت کے خلاف ہے.

2- **الہام: وحی قلبی**: جو بات فرشتے کے واسطے کے بغیر، براہِ راست اللہ تعالی کی طرف سے کسی بندے (نبی وغیرہ) کے دل میں ڈال دی جاتی ہے، بشرطیکہ اس کا اللہ کی طرف سے ڈالے جانے کا بیان ہو، خواہ حالتِ بیداری میں ہو یا خواب میں، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کا بیٹے کو ذبح کرنے کا خواب ہے: ﴿يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ﴾ (بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں) (الصافات: 102)، اور موسی علیہ السلام کی والدہ کو اسے دودھ پلانے کا حکم دیا جانا ہے: ﴿وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ ۖ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ﴾ (اور ہم نے موسی کی ماں کو وحی کی کہ تم اسے دودھ پلاؤ، اور جب اس پر کوئی خطرہ محسوس کرو تو اسے پانی میں ڈال دو) (القصص: 7).

3- **وحی ملکی**: اللہ تعالی کا فرشتے کے ذریعہ کسی نبی پر اپنے احکام نازل فرمانا، کبھی تو فرشتہ اپنی اصلی شکل میں آتا ہے: ﴿وَلَقَدْ رَآهُ بِالأُفُقِ الْمُبِينِ﴾ (اور اس نے (یعنی: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس (یعنی: جبرائیل علیہ السلام) کو روشن افق پہ دیکھا) (التكوير: 23)، اور کبھی کسی انسان کی شکل میں، اور بعض اوقات فرشتے کے نظر آئے بغیر اس کی آواز سنائی دیتی ہے، وحی کے یہ انداز بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ فرماتے ہیں: (أحْيانًا يَأْتِيني مِثْلَ صَلْصَلَة الجَرَس، وهو أَشدُّه عليَّ، ...، وأحيانًا يتمثَّلُ لي المَلَكُ رَجُلًا فيُكَلِّمُني فأَعِي مَا يَقُوْل) (کبھی میرے پاس گھنٹی جیسی آواز کی طرح آتی ہے، جو کہ مجھ پر بہت بھاری ہوتی ہے...، اور کبھی فرشتہ میرے سامنے کسی آدمی کی شکل میں ظاہر ہو کر بات کرتا ہے، جسے میں سمجھ لیتا ہوں) (متفق عليه).

وحی کی ان تینوں کا اقسام کا تذکرہ ارشادِ باری تعالی میں ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ﴾ (کسی انسان کے لائق نہیں کہ اللہ تعالی اس سے (براہِ راست) بات کرے، سوائے یہ کہ الہام کر دے، یا پردے کے پیچھے سے، یا فرشتہ بھیج کر، پس وہ اپنے حکم سے جو چاہے وحی کرتا ہے) (الشورى: 51).

4- **فرشتہ کی طرف سے کوئی بات دل میں ڈال دی جانا**: جیسا کہ فرمانِ نبوی ہے: (إِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رُوْعِي ، أَنَّ نَفْسًا لَن تَمُوتَ حَتَّى تَسْتَكْمِلَ أَجَلَهَا ، وَتَسْتَوْعِبَ رِزْقَهَا...) (جبرائیل نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ کسی جان کو اس وقت تک موت نہ آئے گی جب تک وہ اپنی زندگی اور روزی مکمل نہ کر لے...) (صحيح الجامع: 2085).

5- **اس کے علاوہ وحی کے مزید معانی: اشارہ کرنا**: ﴿فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ أَن سَبِّحُوا بُكْرَةً وَعَشِيًّا﴾ (زکریا علیہ السلام) حجرہ سے اپنی قوم کے سامنے آئے اور انہیں اشارہ کیا کہ صبح وشام اللہ کی تسبیح بیان کرو) (مريم: 11)، اور **حکم کرنا**: ﴿بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا﴾ (کیونکہ تیرے رب نے اسے (زمین کو) حکم دیا ہے) (الزلزله: 5)، **وسوسہ ڈالنا**: ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا﴾ (اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے جن اور انسانی شیطان دشمن بنائے ہیں، جو ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کے لیے چکنی چپڑی باتوں سے وسوسے ڈالتے ہیں) (الانعام: 112).

وحیِ ربانی کی ضرورت واہمیت:

1- وحی الٰہی ربِ کائنات کا وہ احسانِ عظیم ہے جسے خصوصی طور پر بندوں پر جتلایا گیا ہے: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (یقیناً اللہ تعالی نے بندوں پر احسانِ عظیم کیا ہے جو انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیات پڑھ کر سناتا، اور ان کا تزکیہ کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں کتاب وسنت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ یہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے) (آل عمران: 164).

2- **حصولِ علم کے بنیادی ذرائع:**

حصولِ علم کے لیے اللہ تعالی نے انسان کو تین ذرائع دیے ہیں: (1) حواسِ خمسہ. (2) عقل. (3) وحی.

میرے سامنے کوئی آدمی ہے، جسے میں آنکھ سے دیکھ کر معلوم کرتا ہوں کہ یہ: انسان ہے، اور مرد ہے، اس کی رنگت، قد وقامت اور موٹا یا دبلا ہونے کا علم ہوتا ہے، جس کا تعلق حواسِ خمسہ سے ہے، پھر عقل سے معلوم ہوتا ہے کہ: اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے، اس کے ماں باپ ہیں جنہوں نے اسے جنم دیا ہے، لیکن اس کے بعد اس آدمی سے متعلقہ بہت سی چیزیں ہیں جو حواسِ خمسہ یا عقل سے معلوم نہیں ہو سکتیں، مثلاً یہ آدمی کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ زندگی میں اس کے کیا فرائض ہیں؟ ان فرائض کو کیسے ادا کرنا ہے؟ یہ وہ علوم ہیں جو وحی کے بغیر حاصل ہونا ممکن نہیں ہیں، اسی سے وحی کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، اور اسی وحی کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے لوگ طرح طرح کی گمراہیوں کا شکار ہوتے ہیں. جب ہر شخص اپنی ہی سوچ وفکر سے زندگی کی راہیں متعین کرتا ہے، جبکہ ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿قَالَ اهبِطَا مِنهَا جَمِيعًا بَعضُكُم لِبَعضٍ عَدُوّ فَإِمَّا يَأتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشقَىٰ﴾ (اللہ تعالی نے فرمایا: تم سبھی یہاں سے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے، پس جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جو میری اس ہدایت پر چلے گا، وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ بدبخت ہوگا) (طه: 123)، مذکورہ آیت میں وحی کی اتباع کرنے کی جزاء اور اس کی مخالفت واعراض کرنے کا انجام بیان ہوا ہے. لہٰذا وحی ربانی کے بغیر نہ تو زندگی کا مقصد معلوم ہو سکتا ہے، اور نہ ہی رشد وہدایت کا پانا ممکن ہے.

وحی اور کشف والہام میں فرق:

یہ فرق معلوم کرنا دو 2 اعتبار سے ضروری ہے: (1) جب اللہ تعالی کسی بندے پر ایسی چیز کی وحی کرے جو دوسروں سے پوشیدہ ہو تو یہ وحی اللہ کی طرف سے بندے کی کرامت ہے. (2) تاکہ وحی ربانی اور وحی شیطانی میں فرق کیا جاسکے، جو عموماً جادو کے عمل، جنوں کی مدد، اور شیطانی وسوسوں وخیالات کا نتیجہ ہوتا ہے، وحی اور کشف والہام میں بنیادی فرق:

1- چنانچہ وحی اللہ رب العزت کی طرف کسی نبی یا رسول پر نازل ہونے والا حکمِ ربانی ہے، لہٰذا کسی غیر نبی پر وحی نہیں آسکتی چاہے وہ ولایت کے کتنے بڑے درجے کو کیوں نہ پہنچ چکا ہو. جبکہ کشف والہام یہ ہے کہ اللہ تعالی اپنے کسی بندے کے دل میں کوئی خیر کی بات ڈال دے، یا اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی چیز ظاہر کردے، اور یہ انبیاء سے خاص نہیں، بلکہ کسی نبی یا غیر نبی کے لیے ہوسکتا ہے، جیسا کہ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا منبرِ مسجد نبوی پر عراق میں لڑنے والے قائد کو فرمانا: (يَا سَارِيَة الجَبَل) (اے ساریہ پہاڑ کی طرف پناہ لو) (رواه احمد في فضائل الصحابه، وابونعيم والبيهقي في دلائل النبوة، وحسنه ابن كثير وابن حجر والهيثمي والالباني في السلسلة الصحيحة)،

علامہ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اس قصہ سے امیر المؤمنین عمر بن الخطاب کی کرامت ظاہر ہوتی ہے".

2- وحی اور کشف والہام انبیاء واولیاء کے ذاتی اختیار میں نہیں، بلکہ یہ محض اللہ تعالی کی طرف سے ہے، وہ جسے چاہے، جب چاہے، اور جو چاہے عطا فرمادے.

3- انبیاء پر وحی کبھی الہام کی صورت میں بھی نازل ہوتی ہے، اگرچہ انبیاء کا الہام یقینی ہوتا ہے، جو کہ وحی کی ایک قسم ہے، اور جس کی پیروی ضروری ہے، جبکہ اولیاء کا کشف والہام یقینی نہیں ہوتا، اور نہ وہ شریعت میں حجت ہے، بلکہ اگر وہ شریعت کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہو تو مردود اور غیر معتبر ہے.

وحی مَتْلُو اور غیر مَتْلُو میں فرق:

رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی وحی کی دو قسمیں ہیں:

(1) **وحي مَتْلُو**: وہ وحی جس کی تلاوت کی جائے، اور یہ وہ وحی ہے جو اپنے الفاظ ومعانی کے لحاظ سے اللہ تعالی کی طرف سے ہے، اس میں کسی قسم کا تغیر ممکن نہیں، جسے قرآن کا نام دیا جاتا ہے.

(2) **وحي غير مَتْلُو**: وہ وحی جس کے معانی اللہ تعالی کی طرف سے ہوں، اور الفاظ خود رسول اللہ ﷺ کے ہوں، جو کہ احادیث صحیحہ کی صورت میں ہے، ارشادِ نبوی ہے: (اَلا إِنِّي أُوتِيْتُ القُرَآنَ وَمِثْلَهُ مَعَه) (خبردار! مجھے قرآن دیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ اس جیسی (حدیث) دی گئی ہے) (مسند احمد: 17306).

حجیت کے اعتبار سے وحی متلو اور وحی غیر ملتو میں کوئی فرق نہیں، لہٰذا جس طرح وحی متلو (قرآن) اللہ کی طرف سے ہے، اور اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے، ایسے ہی وحی غیر متلو (حدیثِ نبوی) بھی اللہ کی طرف سے ہے، جس پر عمل کرنا ضروری ہے، بلکہ وحی غیر متلو پر عمل کیے بغیر وحی متلو پر عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے.

نزولِ قرآن کا بیان

نزول کے لحاظ سے قرآن کریم کے تین مراحل ہیں:

پہلا مرحلہ: قرآن کا پہلا نزول لوح محفوظ میں ہوا، جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ . فِي لَوْحٍ مَحْفُوظٍ ﴾ (بلکہ یہ تو قرآن مجید جو لوح محفوظ میں ہے) (البروج: 21-22).

دوسرا مرحلہ: قرآن کریم کا لوح محفوظ سے بیت العزۃ میں نازل ہونا، جس کا بیان اِن آیات میں ہوا ہے: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾(ہم نے اس (قرآن) کو لیلۃالقدر میں نازل کیا) (القدر: 1)، ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُبَارَكَةٍ ﴾(ہم اس (قرآن) کو بابرکت رات میں نازل کیا) (الدخان:3) ، ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ (رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا) (البقرة:185) .

تیسرا مرحلہ: بیت العزۃ سے رسول اللہ ﷺ کے دل پر نازل ہونا، جیسا کہ ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الأَمِينُ . عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴾ (اس (قرآن) کو روح الأمین (جبرائیل علیہ السلام) لے کر آپ کے دل پر نازل ہوئے، تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو) (الشعراء: 193-194).

اور یہ نزول آہستہ آہستہ حسبِ ضرورت 23 سال میں مکمل ہوا، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ وَنَزَّلْنَاهُ تَنزِيلاً﴾ (اور قرآن کو متفرق طور پر اس لیے نازل کیا تاکہ اسے لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کریں، اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا) (الإسراء:106).

قرآن رسول اللہ ﷺ پر یکبارگی کیوں نازل نہ ہوا؟

اس کے متعدد اسباب ہیں:

1- **رسول اللہ ﷺ کی حوصلہ افزائی اور دلجمعی**: کفار و مشرکین کی طرف سے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی جاتیں، ان اذیتوں کا مداوی کرنے کے لیے اللہ تعالی ایسی آیات نازل فرماتا جس سے آپ کی اور آپ کے صحابہ کی حوصلہ افزائی ہوتی، یہی مقصد اس ارشادِ باری تعالی میں بیان ہوا ہے: ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ﴾ (اور کافروں نے کہا: کیوں نہ اس (رسول) پر قرآن یکبارگی نازل کیا گیا؟ اسی طرح (اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا) تاکہ اس سے آپ کی حوصلہ افزائی اور دلجمعی ہو) (الفرقان:32) ، مزید فرمان ہے: ﴿وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ﴾ (اور ہم رسولوں کی خبروں میں سے ہر وہ چیز تم پر بیان کرتے ہیں جس سے ہم تمہارے دل کو ثابت کرتے ہیں) (هود: 120)، مزید ارشاد ہے: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (پس صبر کرو جس طرح پختہ ارادہ والے رسولوں نے صبر کیا) (الاحقاف: 35).

2- **مخالفین کے اعتراضات کا جواب**: جیسا کہ فرمان ہے: ﴿وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا﴾ (اور وہ (کافر) آپ کے پاس کوئی مثال نہیں لاتے مگر ہم تمہارے پاس حق اور بہترین تفسیر لاتے ہیں) (الفرقان: 33).

3- **حفظ وفہم میں آسانی**: خصوصاً جن اُمّیین (ان پڑھ لوگوں) پر قرآن نازل ہوا، ان کے لیے ناممکن تھا کہ وہ قرآن یکبارگی سمجھ لیتے اور اسے یاد کر لیتے، اس لیے قرآن تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کیا گیا تاکہ اسے سمجھنے اور یاد کرنے میں آسانی رہے.

4- **شرعی احکام میں تدریج**: نزولِ قرآن کے وقت عرب کا معاشرہ انتہائی گمراہیوں کا شکار تھا، اور کئی برائیاں ان کے ہاں جڑ پکڑ چکی تھیں، اس لیے حکمتِ عملی کا تقاضا تھا کہ ان کی اصلاح کا عمل تدریجاً ہو، تاکہ انہیں شریعتِ اسلامیہ کے احکامات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے بوجھ محسوس نہ ہو، جیساکہ شراب کی حرمت کے تدریجی مراحل کا بیان ہے.

5- منکرین ومخالفین کے لیے چیلنج اور انہیں عاجز کرنے کے لیے، کیونکہ جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا، منکرین کو نئے نئے چیلنج کیے جاتے، جنہیں وہ قبول کرنے کی جرات نہ کر سکتے.

سب سے پہلے اور آخر میں کیا نازل ہوا؟

سب سے پہلے اور آخر میں نازل ہونا دو لحاظ سے ہے:

(1) مطلق طور پر سب سے پہلے اور آخر میں نازل ہونا.

(2) کسی خاص اعتبار سے سب سے پہلے اور آخر میں نازل ہونا.

چنانچہ مطلق طور پر راجح قول کے مطابق سب سے پہلے ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات نازل ہوئیں. جیساکہ اُم المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی متفق علیہ حدیث میں اس کی صراحت ہے، جبکہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا کہنا کہ سب سے پہلے: ﴿يَا أَيُّها الْمُدَّثِّرُ﴾ نازل ہوئی (البخاري: 4924، مسلم: 161)، تو یہ اولیت مطلق نہیں، بلکہ آپ ﷺ کو رسالت کی ذمہ داری ملنے کے حوالے سے مقید ہے، چنانچہ بعض اہلِ علم کا کہنا ہے: آپ ﷺ کو ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ سے نبوت، اور ﴿يَا أَيُّها الْمُدَّثِّرُ﴾ سے رسالت حاصل ہوئی.

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کی ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ سورۃ العلق کی آیات نازل ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک وحی بند رہی، اس کے بعد سورۃ مدثر کی آیات نازل ہوئیں، تو اس لحاظ سے انہیں پہلی وحی کا نام دیا گیا. (أصول في التفسير لابن عثيمين ص(14)

جہاں تک سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ہے تو اس میں مفسرین کے درمیان کافی اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن راجح ترین قول جو کہ اکثر مفسرین کی رائے ہے، وہ یہ کہ مطلق طور پر سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت یہ ہے: ﴿ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ...﴾ الآية (البقرة: 281)، اور مطلق طور پر سب آخر میں نازل ہونے والی مکمل سورت سورۃ النصر ہے، اس کے علاوہ جن آیات یا سورتوں کے بارے میں سب سے آخر میں نازل ہونے کا بیان ہوا ہے تو کسی خاص اعتبار سے ہے، نہ کہ مطلق طور پر. (مناهل العرفان، المبحث الرابع).

اسباب نزول: اس موضوع پر کچھ بیان (التفسیر بالماثور: تفسیر باسباب النزول) میں ہو چکا ہے.

مکی اور مدنی اور ان کی خصوصیات

رسول اللہ ﷺ پر قرآن کریم پہلی وحی سے لے کر آخری وحی تک تئیس 23 سال میں مسلسل نازل ہوتا رہا، اس میں سے تیرہ 13 سال مکہ اور دس 10 سال مدینہ میں گذرے، چنانچہ جو سورتیں ہجرتِ مدینہ سے پہلے نازل ہوئیں، انہیں مکی سورتیں کہا جاتا ہے، چاہے وہ مکہ میں نازل ہوئی ہوں یا مکہ کے گرد ونواح میں، جیسا کہ ﴿وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِنَ الْجِنِّ ﴾(احقاف: 29) کا واقعہ طائف اور مکہ کے درمیان وادی نخلہ میں پیش آیا. اور جو سورتیں ہجرتِ مدینہ کے بعد نازل ہوئیں، وہ مدنی کہلاتی ہیں، خواہ وہ مدینہ میں نازل ہوئی ہوں، یا مدینہ کے باہر نازل ہوئی ہوں، بلکہ ممکن ہے کہ ہجرت کے بعد مکہ میں ہی نازل ہوئی ہوں، جیسا کہ سورۃ النصر ہے، جو ایامِ تشریق کے دوران منیٰ میں نازل ہوئی.

مکی ومدنی کی معرفت کے لیے صحابہ وتابعین سے صحیح روایات کا پایا جانا ضروری ہے، لہٰذا صرف ظن وتخمین سے کسی سورت کو مکی یا مدنی ہونے کا حکم نہیں دیا جاسکتا.

سورتوں کے مکی ومدنی ہونے کے لحاظ علماء نے ان کی چار 4 قسمیں بیان کی ہیں:

1- جو سورتیں خالصتاً مکی ہیں، جن میں کوئی مدنی آیت نہیں ہے، جیسا کہ سورۃ المدثر وغیرہ ہیں.

2- جو سورتیں خالصتاً مدنی ہیں، جن میں کوئی مکی آیت نہیں ہے، جیسا کہ سورۃ البقرۃ اور آل عمران وغیرہ ہیں.

3- جو سورتیں مکی ہیں، لیکن ان میں کچھ آیات مدنی ہیں، جیسا کہ سورۃ الانعام مکی ہے، لیکن اس میں ﴿وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِذْ قَالُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّن شَيْءٍ...﴾(الانعام: 91) کے بارے میں مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیت مدینہ میں یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی، (تفسير الطبري).

4- جو سورتیں مدنی ہیں، لیکن ان میں کچھ آیات مکی ہیں، جیسا کہ سورۃ الانفال مدنی ہے، لیکن اس میں ﴿وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ﴾(الانفال:30) اور اس کے بعد کی آیات کے بارے میں مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیت مکی ہے. (تفسير الطبري)

اس سے معلوم ہوا کہ ان سورتوں کا مکی یا مدنی ہونا غالب اعتبار سے ہے، ورنہ بعض مکی سورتوں میں مدنی آیات، اور بعض مدنی سورتوں میں مکی آیات بھی پائی جاتی ہیں.

مکی سورتوں کی بعض امتیازی علامات وخصوصیات:

مکی سورتوں کی امتیازی علامات:

1- ہر وہ سورت جس میں سجدہ تلاوت ہو وہ مکی سورت ہے.

2- ہر وہ سورت جس میں لفظ (کلا) آیا ہو وہ مکی سورت ہے.

3- جو سورتیں حروف مقطعات سے شروع ہوئی ہوں وہ مکی ہیں، سوائے سورۃ البقرۃ اور آل عمران کے.

4- جن سورتوں میں (يا أيها الناس) کا خطاب آیا ہے وہ مکی ہیں، سوائے سورۃ البقرۃ اور سورۃ الحج کے.

5- مکی سورتوں کی آیات عموماً چھوٹی چھوٹی، ٹھوس اور شدید الفاظ کی حامل ہیں، جن میں تشبیہات وتمثیلات، کنایات واستعارات کی کثرت ہے، کیونکہ ان سے مخاطب وہ لوگ تھے جنہیں اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز تھا.

مدنی سورتوں کی امتیازی علامات:

1- جن سورتوں میں (يا أيها الذين آمنوا) سے مخاطب کیا گیا ہے، وہ عموماً مدنی ہیں.

2- مدنی سورتیں عموماً طویل آیات پر مشتمل ہیں.

3- مدنی سورتوں کا لب ولہجہ مکی سورتوں کی نسبت قدرے نرم اور عام الفاظ میں ہے.

4- جن سورتوں میں منافقین کا ذکر ہے وہ مدنی ہیں، سوائے سورۃ العنکبوت کے.

5- جن سورتوں میں اہلِ کتاب سے بحث ومجادلہ کا بیان ہے وہ مدنی ہیں.

مکی اور مدنی سورتوں کی موضوعی اعتبار سے خصوصیات:

1- عموماً مکی سورتوں میں اندازِ بیان فصاحت و بلاغت پر مبنی قوی، ٹھوس اور تہدید ووعید کے لہجہ میں ہے، کیونکہ ان آیات کے مخاطب عموماً متکبر کافر، منکرینِ حق، اور معاند وہٹ دھرم لوگ تھے، تو یہی خطاب ان کے لائق تھا، جیسا کہ یہ انداز واضح طور پر سورۃ القمر، سورۃ الحاقۃ اور سورۃ المدثر وغیرہ میں پایا جاتا ہے، جبکہ مدنی سورتوں کا اندازِ بیان قدرے نرم اور سہل وسادہ الفاظ میں ہے، کیونکہ یہاں مخاطب مطیع وفرمانبردار مومن تھے.

2- مکی سورتوں میں بکثرت توحید ورسالت کے دلائل، سابقہ انبیاء اور ان کی قوموں کا تذکرہ، آخرت وبعث وجزاء، اور جنت وجہنم کا بیان ہے، کیونکہ یہاں مخاطب وہ مشرکین تھے جو توحید ورسالت اور آخرت کے منکر تھے، لہٰذا اُنہیں اِنہیں موضوعات کی زیادہ ضرورت تھی، جبکہ مدنی سورتوں میں عبادات، حلال وحرام، نکاح وطلاق کے احکام ومسائل اور خاندانی واجتماعی تعلقات کا بیان ہے.

3- مکی سورتوں میں کفار ومعاندین اور منکرین کا بیان ہے، اور انہیں مخاطب کیا گیا ہے، جبکہ اس کے مدّمقابل مدنی سورتوں میں اہلِ ایمان کو مخاطب کیا گیا ہے، ان کی صفات بیان ہوئی ہیں، اور ساتھ ساتھ منافقین کی نشانیاں اور ان کی کارستانیاں کا تذکرہ کیا گیا ہے.

4- اگر مکی سورتوں میں زیادہ تر توحید ورسالت اور آخرت پر ایمان کی دعوت دی گئی ہے تو مدنی سورتوں میں اس دعوت کے مخالفین سے جہاد وقتال کے احکامات اور صلح وامن کے معاہدات کا بیان ہے.

5- مکی سورتوں میں عموماً زمانہ جاہلیت کے جرائم: ناحق قتل، زنا بدکاری، یتیم کا مال کھانا، بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے جیسے جرائم کا بیان ہے، جبکہ مدنی سورتوں میں اس طرح کے جرائم کی حدود وتعزیرات، اور معاشرے کی اصلاح کے لیے اخلاق وآداب کا بیان ہے.

مکی ومدنی کی معرفت کے فوائد:

1- ناسخ ومنسوخ کی پہچان.

2- لوگوں کے احوال کے پیشِ نظر شریعت کے احکام میں تدرج وسہولت کا بیان.

3- قرآن کی فصاحت وبلاغت، کہ اگر کہیں مخاطبین کے پیشِ نظر قوت وشدت کا انداز ہے تو دوسری جگہ نرمی وآسانی کا انداز ہے.

4- دین کے داعیوں کی تربیت کے لیے قرآنی منہج اور ربانی تعلیمات.

مکی ومدنی سورتوں کی تعداد:

قرآن کریم کی 114 سورتوں میں سے 82 سورتوں کے مکی ہونے پر اتفاق ہے، اور بیس 20 سورتوں کے مدنی ہونے پر اتفاق ہے، جبکہ بارہ 12 وہ سورتیں ہیں جن کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف پایا جاتا ہے، اگرچہ ان میں بعض کے بارے میں راجح ہے کہ وہ مکی ہیں، جیسا کہ سورۃ الفاتحہ، اخلاص اور معوذتین ہیں.

کیا سورتوں کے نام توقیفی ہیں یا اجتہادی؟

علماء کا اس بارے اختلاف ہے کہ کیا تمام سورتوں کے نام توقیفی: یعنی نبی کریم ﷺ کی طرف سے مقرر شدہ ہیں، یا بعض کے توقیفی اور بعض کے صحابہ کرام کے اجتہاد سے ہیں.

چنانچہ اکثر علماء کی رائے ہے کہ تمام سورتوں کے نام توقیفی ہیں، یعنی نبی کریم ﷺ کی طرف مقرر شدہ ہیں.

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "لِسُوَر القرآن اَسماءٌ سمَاهَا بِهَا رسولُ الله صلى الله عليه وسلم" "سورتوں کے نام نبی کریم ﷺ کی طرف سے مقرر کیے گئے ہیں". (جامع البيان: 100/1).

علامہ سیوطی فرماتے ہیں: "تمام سورتوں کے نام توقیفی ہیں، جو احادیث وآثار سے ثابت شدہ ہیں". (الإتقان : 148/1).

اسی قول کو علامہ الطاہر بن عاشور، ڈاکٹر إبراہیم الھویمل اور ڈاکٹر فہد الرومی جیسے بعض معاصر علماء و باحثین نے ترجیح دی ہے (التحرير والتنوير(88/1)، المختصر في أسماء السور ص(135)، دراسات في علوم القرآن ص(118)).

جبکہ دوسرے بعض علماء کا کہنا ہے کہ بعض سورتوں کے نام رسول اللہ ﷺ کی طرف سے، اور بعض کے نام صحابہ کرام کے اجتہاد سے ہیں، جیسا کہ فتاوى اللجنة الدائمه (4/16) میں ہے: "ہم کوئی ایسی دلیل نہیں جانتے کہ تمام سورتوں کے نام رسول اللہ ﷺ سے مقرر کیے گئے ہیں، اگرچہ بعض صحیح احادیث میں کچھ سورتوں کے ناموں کا ذکر آتا ہے، جیسا کہ سورۃ البقرۃ اور آل عمران ہیں، جبکہ باقی سورتوں کے بارے ظاہر یہی ہے کہ ان کے نام صحابہ کرام نے رکھے ہیں".

ناسخ و منسوخ کا بیان

نسخ کی تعریف:

نسخ کا لغوی معنی: مٹانا، ازالہ کرنا، اور اٹھا لینے کے معنی ہیں.

نسخ کے لفظی معنی نقل کرنے کے بھی ہیں جیسے کتاب کے ایک نسخے سے دوسرا نقل کرلینا۔

نسخ کا اصطلاحی معنی: رَفْعُ الْحُكْمِ الشَّرْعِيّ بَدِلِيْلٍ شَرْعِيٍّ مُتَأَخِّر. کسی شرعی حکم کو متأخر شرعی دلیل سے ختم کرنا (مناهل العرفان).

متقدمین کے ہاں نسخ کا مفہوم بہت وسیع تھا، چنانچہ وہ لفظ نسخ: مطلق اور مقید اور عام وخاص کے لیے بھی استعمال کرتے تھے، جیسا کہ ﴿ وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّى يُؤْمِنَّ ﴾ کی تخصیص: ﴿ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ ﴾ سے کی گئی، عکرمہ اور حسن بصری نے اسے نسخ کا نام دیا ہے (تفسير الطبري: 4213)، جبکہ متاخرین کی اصطلاح میں سابقہ حکم کو کلی طور پر ختم کر دینے کو نسخ کہتے ہیں.

شروطِ نسخ:

1. منسوخ شدہ شرعی حکم ہو جو شرعی دلیل سے ثابت ہوا ہو، کسی عرف یا عادت سے ثابت نہ ہو، ﴿ الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ﴾ طلاقِ جاہلیت کی ناسخ نہیں، بلکہ ابتداءً شرعی حکم ہے.
2. منسوخ شدہ حکم ناسخ سے پہلے ثابت شدہ ہو، جس کا علم لفظ سے ہوتا ہے ﴿ الآنَ خَفَّفَ اللهُ عَنْكُمْ ﴾، یا پھر تاریخ سے.
3. ناسخ قرآن وسنت کی شرعی دلیل ہو، چنانچہ قرآن وسنت سے ثابت شدہ حکم اجماع وقیاس سے منسوخ نہیں کیا جاسکتا.
4. ناسخ منسوخ سے الگ اور اس سے متأخر ہو.
5. دونوں دلیلوں میں توفیق پیدا کرکے عمل کرنا ممکن نہ ہو، کیونکہ اصل یہ ہے ہر دلیل پر عمل کیا جائے، اور کسی دلیل کو معطل نہ کیا جائے. (ينظر: نواسخ القرآن لابن الجوزي ص(135)

نسخ کی صورت:

کسی حکم کی منسوخی دو وجہ سے ہوتی ہے اوّل تو یہ کہ حکم جاری کرنے والے سے کوئی بھول یا غلطی ہو جائے، جس کی وجہ سے بعد میں اس حکم کی منسوخی کی ضرورت پیش آئے۔ ظاہر ہے کہ کلام اللہ میں یہ ناممکن ہے، کیونکہ اللہ کی علیم و خبیر ذات کسی قسم کی غلطی، یا بھول چوک سے منزّہ و پاک ہے، اس لیے جو بھی حکم دے گا اس میں کسی غلطی کا امکان نہیں ہو سکتا، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے احکام میں بھی یہ چیز نہیں ہو سکتی، کیونکہ دین کے احکامات براہِ راست احکم الحاکمین کی طرف سے نازل ہوئے ہیں، اور رسول اللہ ﷺ انہیں بیان فرماتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جس طرح قرآن کے احکام پر عمل کرنا فرض ہے اسی طرح حدیث کے احکام کی پیروی کرنا بھی ضروری ہے، لہٰذا حدیث کے احکام میں بھی کسی حکم کی تبدیلی کا سبب یہ نہیں ہو سکتا۔

کسی حکم کی تبدیلی و منسوخی کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ محکوم کی حالت بدلنے سے مصلحت بھی بدل گئی ہو، اس لیے حکم بھی بدل گیا، جیسے کہ مریض کی حالت بدل جانے پر دوائی بدل دی جاتی ہے۔ مثلاً ایک حکم دیا گیا جو اس وقت کے ماحول اور محکوم کے مطابق تھا، مگر

بعد میں جب ماحول میں تبدیلی آ گئی، اور لوگوں کے حالات بدل گئے، تو اب حاکم کی مصلحت بھی بدل گئی، لہٰذا اس نے محکوم اور ماحول کی بھلائی اور اصلاح کی خاطر اس سے پہلے حکم کو بدل دیا اور اس جگہ دوسرا حکم نازل کر دیا، ظاہر ہے کہ ایسی نسخ صحیح اور جائز ہو گی، اور یہی تبدیلی و نسخ قرآن واحادیث کے احکام میں ہوتی ہے.

نسخ واقع ہونے میں اختلاف:

امتِ مسلمہ کا اجماع ہے کہ احکام باری تعالیٰ میں نسخ کا ہونا نہ کہ صرف جائز ہے، بلکہ واقع ہوتا چلا آیا ہے، اور پروردگار کی حکمت بالغہ کا دستور بھی یہی ہے، صدیوں تک اس مسئلہ پر اجماع رہا ہے، جس کا انکار بعض معتزلہ نے کیا ہے، اسی طرح ابو مسلم اصبہانی کا کہنا ہے کہ قرآن میں نسخ واقع نہیں ہوتی، لیکن اس کا یہ قول ضعیف اور مردود ہے، اسی طرح عصرِ حاضر کے چند مغرب پرستوں نے یہ فتنہ پیدا کیا ہے کہ قرآن مجید میں نسخ ہو ہی نہیں سکتی، ان سے پہلے یہودی نسخ کا انکار کرتے رہے ہیں.

نسخ کے منکرین کے شبہات:

منکرینِ نسخ کا شبہہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں ''نسخ'' نہیں ہو سکتی، کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اگر ''نسخ'' کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک حکم کو مناسب سمجھا تھا بعد میں (معاذاللہ) اپنی غلطی واضح ہونے پر اسے واپس لے لیا، جسے اصطلاح میں ''بدا'' کہتے ہیں، اسی لیے یہود قرآن پر ایمان نہ لانے کی حجت پیش کرتے ہیں کہ اس کتاب میں بعض آیات منسوخ ہیں، اگر یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہوتی تو جس عیب کی وجہ سے یہ منسوخ ہوئی ہیں، کیا اس عیب کی خبر اللہ کو پہلے نہ تھی؟

جواب: درحقیقت عیب نہ پہلی بات میں تھا نہ پچھلی میں ہے، لیکن اللہ احکمُ الحاکمین اپنی حکمت سے ہر وقت کے تقاضوں کے مطابق جو چاہے حکم کرے، پہلے وقت میں وہی حکم مناسب تھا، اور اب دوسرا حکم مناسب ہے، چنانچہ نسخ کا مطلب رائے کی تبدیل نہیں، بلکہ ہر زمانے میں اس دور کے لیے مناسب احکام دینا ہیں، اور نہ ہی ناسخ کا یہ کام ہے کہ وہ منسوخ کو غلط قرار دے، بلکہ حالات کے پیشِ نظر نئے حکم سے پہلے حکم کو منسوخ کرنا ہے. چنانچہ احکام اور ان کی حکمتیں، بندے اور ان کی مصلحتیں، اور نواسخ ومنسوخات سب کے سب اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے ہیں۔ [مناہل العرفان،77/2]

نسخ کے عقلی و نقلی ثبوت:

نسخ: قرآن، سنت، اجماع، قیاس، تاریخ اور نظامِ فطرت سے ثابت ہے.

قرآن سے نسخ کی دلیل:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (ہم جو آیت منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے برابر نازل کر دیتے ہیں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے) (البقرة: 106)، مزید ارشاد ہے: ﴿وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَكَانَ آيَةٍ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مُفْتَرٍ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (جب ہم ایک آیت کو دوسری آیت سے بدلتے ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے جو وہ اتارتا ہے، تو (کافر) کہتے ہیں: تم تو خود ہی بنالاتے ہو، یہ بات نہیں، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں) (النحل: 101).

حدیث سے نسخ کی دلیل:

ارشادِ نبوی ہے: (وإِنَّهَا لَمْ تَكُنْ نُبُوَّةٌ قَطُّ إِلَّا تَنَاسَخَتْ) "کوئی نبوت ایسی نہیں، جس کے احکام منسوخ نہ ہوئے ہوں"۔(مسلم: 2967) ، ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: " كَانَ فِيمَا أُنْزِلَ مِنَ الْقُرْآنِ: عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَعْلُومَاتٍ يُحَرِّمْنَ، ثُمَّ نُسِخْنَ بِخَمْسٍ مَعْلُومَاتٍ، فَتُوُفِّيَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَهُنَّ فِيمَا يُقْرَأُ مِنَ الْقُرْآن". (مسلم (1452)). بریدہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں: (كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ فَزُورُوهَا). مسلم (977)

نسخ تاریخ کے آئینہ میں:

نسخ پہلی شریعتوں میں موجود ہے، آدم علیہ السلام کی بیٹیاں بیٹے آپس میں بھائی بہن ہوتے تھے، لیکن نکاح جائز تھا پھر اسے حرام کر دیا، نوح علیہ السلام جب کشتی سے اترتے ہیں تب تمام حیوانات کا کھانا حلال تھا، لیکن پھر بعض کی حلت منسوخ ہو گئی، دو بہنوں کا نکاح اسرائیل اور ان کی اولاد پر حلال تھا، لیکن پھر توراۃ میں اور اس کے بعد حرام ہو گیا، ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا پھر قربان کرنے سے پہلے ہی منسوخ کر دیا، اسی طرح کے اور بہت سے واقعات موجود ہیں اور خود یہودیوں کو ان کا اقرار ہے، اور قرآن بھی اس پر گواہ ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ﴾ (اور یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے ان پر بعض پاکیزہ چیزیں حرام کی گئیں جو پہلے ان پر حلال کی گئی تھیں) (النساء: 160).

شریعت اسلامیہ کی تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء اسلام میں صحابہ کرام جب نئے نئے دین اسلام میں داخل ہو رہے تھے، ان کی ذھنی و عملی تربیت کے لئے اللہ تعالی نے تدریجی طور پر اصلاحی احکام نازل فرمائے، اور یہ تبدیلی حکمتِ الٰہیہ کے عین مطابق ہے، اور کسی بھی اعتبار سے کوئی عیب نہیں، حکیم وہ نہیں ہے جو ہر قسم کے حالات میں ایک ہی نسخہ پلاتا رہے، بلکہ حکیم وہ ہے جو مریض اور مرض کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ نسخہ میں ان کے مطابق تبدیلیاں کرتا رہے۔

نسخ کی عقلی دلیل:

عقلاً نسخ محال نہیں، اس لئے کہ جس طرح اللہ تعالی اپنے کاموں میں بااختیار ہے، اسی طرح اپنے حکموں میں بھی بااختیار ہے، جو چاہے اور جب چاہے پیدا کرے۔ اسی طرح جو چاہے اور جس وقت چاہے حکم دے. ابن قدامہ فرماتے ہیں: "عقلی طور پر کوئی مانع نہیں کہ کسی چیز میں کسی وقت میں مصلحت ہو اور دوسرے وقت میں وہ مصلحت نہ ہو" (روضة الناظر: 75/1)

دلیل نظامِ فطرت:

کائنات کا نظام نسخ کے اصول پر چل رہا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغہ سے موسموں میں تبدیلیاں پیدا کرتا رہتا ہے، کبھی سردی ہے تو کبھی گرمی، کبھی بہار ہے تو کبھی خزان، اور کبھی برسات ہے تو کبھی خشک سالی ہے، یہ سارے تغیرات اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے عین مطابق ہیں، نہ کہ اللہ تعالی کی رائے میں تبدیلی ہے، یہی معاملہ شرعی احکام کے نسخ کا ہے، اُسے ''بدا'' قرار دے کر کوئی عیب سمجھنا انتہائی درجہ کی بیوقوفی اور حقائق سے بیگانگی ہے۔

ناسخ و منسوخ کی پہچان کا طریقہ:

نسخ کی پہچان کے 5 طریقے ہیں:

1- نصِ قرآنی سے اس کا تاخر ثابت ہو تو متأخر (بعد والے) کو ناسخ اور مقدم (پہلے والے) کو منسوخ کہا جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی نے جہاد میں تخفیف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا﴾ .

2- نبوی کلام سے: (كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ، أَلا فَزُورُوهَا).

3- صحابی کے بیان سے، جیسا ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:(كَانَ فِيمَا أُنْزِلُ فِي اَلْقُرْآنِ: عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَعْلُومَاتٍ يُحَرِّمْنَ, ثُمَّ نُسِخْنَ بِخَمْسٍ مَعْلُومَاتٍ, فَتُوُفِّيَ رَسُولُ اَللَّهِ - ﷺ -وَهِيَ فِيمَا يُقْرَأُ مِنَ اَلْقُرْآنِ).

4- کسی آیت کے متقدم اور دوسری کے متأخر ہونے کا ثبوت، جبکہ دونوں آیات میں جمع ممکن نہ ہو.

5- کسی آیت کے متقدم اور دوسری کے متأخر ہونے پر امتِ مسلمہ کا اجماع ہونا.

وقوعِ نسخ کا زمانہ:

چونکہ نسخ صرف قرآن وسنت سے ہوتی ہے، لہٰذا یہ صرف وحی کے زمانہ میں ممکن ہے، آپ ﷺ کی وفات کے بعد کوئی شرعی حکم منسوخ نہیں ہو سکتا، کیونکہ وحی کے انقطاع کے بعد شرعی احکام میں کوئی ردوبدل نہیں، لہٰذا ان کا منسوخ ہونا بھی ممکن نہیں.

نسخ کی حکمت اس کے فائدے:

1. بندوں کی سہولت کے پیشِ نظر شرعی احکام کا تدریجاً بیان. لہٰذا شروع میں روزہ رکھنے کی بجائے فدیہ دینے کی اجازت دی جانا، اور ایمان کی پختگی کے بعد بغیر عذر کے روزہ رکھنے کا حکم.
2. کسی غلط عمل کی روک تھام کے لیے تدریجی مراحل، جیسا کہ شراب کی حرمت ہے، جو ان لوگوں کی گھٹی میں پڑی تھی.
3. بندوں کی مصلحت کے پیشِ نظر احکام میں تبدیلی جیسا کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے تناسب مقرر کیا جانا.
4. ایمان وعقیدہ کے رسوخ تک بعض چیزوں سے منع کر دیا جانا، اس کے بعد اجازت دی جانا، جیسا کہ قبروں کی زیارت کا مسئلہ ہے.
5. بندوں کے امتحان وابتلاء کا مقصد، تاکہ مطیع ونافرمان کی پہچان ہو.
6. زیادہ اجر وثواب کے مقصد کے پیش نظر حکم میں تبدیلی.

نسخ کن چیزوں میں واقع ہوتی ہے؟

ناسخ ومنسوخ کا تعلق صرف شرعی احکام سے ہے، جبکہ عقائد، عبادات ومعاملات کے اصول، اخلاق وآداب، اور اخبار واقعات میں نسخ نہیں ہوتی.

علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں: ناسخ ومنسوخ کا تعلق صرف کتاب وسنت کے شرعی احکام سے ہے، جبکہ اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے خبروں میں نسخ واقع ہونا ممکن نہیں ہے. (التمہید(3/ 215)

امام ابن جریر فرماتے ہیں: "احکام میں تبدیلی اس طرح ہوتی ہے کہ: حلال کو حرام، حرام کو حلال، جائز کو ناجائز، ناجائز کو جائز وغیرہ امر ونہی، جائز اور ممنوع کاموں میں نسخ ہوتی ہے، ہاں جو خبریں دی گئی ہیں واقعات بیان کئے گئے ہیں اور اللہ کی قدرت وعظمت کی دلیلیں بیان ہوئی ہیں ان میں ردوبدل وناسخ ومنسوخ نہیں ہوتی" (تفسير الطبري: 472/2)

نسخ کی اقسام:

نسخ کے قائلین کا نسخ کی درج ذیل اقسام پر اتفاق ہے:

(ا) **نسخ القرآن بالقرآن:** پہلے پہل مسلمانوں کو حکم تھا کہ ایک مسلمان دس کافروں سے لڑے اور ان کے مقابلے پر جما رہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ﴾ (الانفال: 65) لیکن پھر یہ حکم منسوخ کرکے دو کے مقابلہ میں صبر کرنے کا حکم ہوا: ﴿الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا ۚ فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (الانفال:66)

(ب) **نسخ السنة بالقرآن:** حدیث کے کسی حکم کو کتاب اللہ کے ذریعہ منسوخ قرار دے دیا جانا، جس کی مثال: آپ ﷺ اور صحابہ کرام نے غزوہ خندق میں سورج غروب ہونے کے بعد نمازیں قضا کیں، اس کے بعد حالتِ جنگ میں نمازِ خوف کا حکم دیا جانا، اسی طرح بیت المقدس کا قبلہ ہونا جو کہ سنت سے ثابت تھا اسے قرآن سے منسوخ کیا جانا: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (البقرة: 144)

(ج) **نسخ السنة بالسنة:** حدیث کے کسی حکم کو حدیث ہی کے ذریعہ منسوخ کر دیا گیا ہو، ابو الْعَلَاءِ بْنُ الشِّخِّيرِ فرماتے ہیں: " كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَنْسَخُ حَدِيثُهُ بَعْضُهُ بَعْضًا ، كَمَا يَنْسَخُ الْقُرْآنُ بَعْضُهُ بَعْضًا. " نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث دوسری احادیث کو اس طرح منسوخ کرتی ہیں جیسا کہ قرآن کا بعض حصہ بعض کو منسوخ کرتا ہے"، (صحيح مسلم : 525) اور بریدۃ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے: (كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ، فَزُورُوهَا). مسلم (977)

کیا حدیث نبوی سے قرآن منسوخ ہو سکتا ہے؟

اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے:

القول الأول: قرآن کے کسی حکم کا حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوخ ہونا ممکن ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ حقیقت میں وہ بھی وحی مِنَ اللہ ہے، ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى *إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى﴾ (النجم/ آيت: 3-4)، فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن ایسی وحی ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے، اور جس کا مضمون براہ راست بارگاہ الوہیت سے اترتا ہے، جبکہ حدیثِ رسول کا معنی اللہ کی طرف سے اور اس الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہیں، (جس حدیث میں بیان ہے کہ سنت سے قرآن منسوخ نہیں ہوتا، یہ حدیث ضعیف ہے، ابن الجوزی فرماتے ہیں: ھذا حدیث منکر، اس کی سند میں: جبرون بن واقد متہم اور ساقط الاعتبار ہے، (لسان المیزان 94/2)

حدیث سے قرآن منسوخ ہونے کی مثال: حدیث: (لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ) (الترمذي: حسن صحيح) سے اللہ کے فرمان: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ﴾ (البقرة: 081)، کو نسخ کیا گیا ہے، اگرچہ کہا جاتا ہے کہ سابقہ آیت ﴿يُوصِيكُمُ اللهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ﴾ (سورة النساء: 11) سے منسوخ ہے:

ابن السمعانی نے کتاب «أفعال الرسول ودلالتها على الأحكام» میں بعض وہ آیات جن کے بارے کہا گیا ہے وہ حدیث سے منسوخ ہیں، ذکر کرنے کے بعد کہا ہے "والصحيح أن الأحاديثَ مُخَصِّصَةٌ وَلَيْسَتْ نَاسِخَة" صحیح یہ ہے کہ یہ احادیث تخصیص کرتی ہیں نہ کہ ناسخہ ہیں.

القول الثانی: بعض دوسرے علماء کا موقف ہے کہ حدیثِ نبوی سے قرآن منسوخ نہیں ہوتا، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "سنت قرآن کی تفسیر کرتی، جبکہ قرآن کو صرف قرآن ہی منسوخ کرتا ہے"، اسی طرح ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے صراحت کی ہے کہ سنت سے قرآن کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا، اور یہی قرآن کی حرمت کا تقاضا ہے"، امام شوکانی فرماتے ہیں: "علامہ صیرفی اور خفاف نے اسی کو یقینی کہا ہے، بلکہ بعض علماء شافعیہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے.

بعض علماء کا کہنا ہے کہ صحیح احادیث میں قرآن کو منسوخ کرنے والی کوئی چیز نہیں، حتی کہ غزالی کہتے ہیں: ایسا واقعہ پیش ہی نہیں آیا.

مزید یہ کہ بعض علماء نے متواتر اور آحاد میں فرق کیا ہے، چنانچہ اکثر علماء کا موقف ہے کہ آحاد حدیث سے قرآن منسوخ نہیں ہوتا، کیونکہ قرآن متواتر اور یقینی ہے، جبکہ آحاد ظنی ہے، اور ظنی دلیل متواتر کو منسوخ نہیں کر سکتی.

اور اگر متواتر حدیث ہو تو اس سے قرآنی آیت منسوخ ہونے میں علماء کا اختلاف ہے، چنانچہ امام مالک، ابو حنیفہ اور احمد ایک روایت میں اسے جائز قرار دیتے ہیں، جبکہ امام شافعی، اہلِ ظاہر، اور احمد ایک روایت میں اسے ناجائز قرار دیتے ہیں.

کیا اجماع سے قرآن وسنت منسوخ ہو سکتے ہیں؟

جمہور علماء کا یہ موقف ہے کہ اجماع کسی قرآنی آیت یا حدیث کو منسوخ نہیں کرتا، کیونکہ:

1- اجماع ہوتا ہی رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ہے، اور آپ کی وفات کے بعد کسی چیز کا منسوخ ہونا ممکن نہیں.

2- اجماع سے نسخ ہونے کا معنی یہ ہے کہ علماء امت نے قرآن یا حدیث کے خلاف کسی بات پر اجماع کر لیا ہے. اور ایسا ہونا ممکن نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ علماء امت کا کسی مسئلہ پر اجماع کسی نص کے منسوخ ہونے کی دلیل ہو سکتا ہے.

اسی طرح قرآن وحدیث کی کوئی نص اجماع کو نسخ نہیں کرتی، کیونکہ اجماع ہوتا ہی قرآن وحدیث کی بنیاد پر ہے. (الفقيه والمتفقه للخطيب البغدادي (1/253-256) روضة الناظر (1/330).

اسی طرح قیاس بھی کسی نص یا اجماع کو نسخ نہیں کرتا. کیونکہ قیاس کے صحیح ہونے کی شرط ہی یہ ہے کہ وہ نص کے خلاف نہ ہو، اور اجماع کے لیے بھی ضروری ہے قرآن وسنت کی شرعی دلیل پر ہو، تو جب قیاس اجماع کے خلاف ہو تو اس کا معنی ہے کہ وہ نص کے بھی خلاف ہے.

نسخ کی دوسری تقسیم:

(1) کسی آیت کا بغیر کسی بدل منسوخ ہونا، یعنی کوئی حکم منسوخ کر دیا جائے، اور اس کے بدل کوئی دوسرا حکم نازل نہ ہو، جیسا کہ علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "قرآن کریم میں ایک آیت ہے، جس پر نہ مجھ سے پہلے کسی نے عمل کیا ہے، اور نہ کوئی میرے بعد کرنے والا ہے، کیونکہ اس کا حکم فرض کیے جانے کے بعد منسوخ ہو گیا ہے: ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً ﴾ (المجادلة: 12) (تفسير الطبري: 248/23)

(2) کسی آیت کا دوسری آیت کے بدل منسوخ ہونا: جس کی تین صورتیں ہیں:

(ا) **مشکل حکم کو آسان حکم سے منسوخ کرنا:** ﴿ الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا ۚ فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴾ (الانفال:65)، **جس میں میدان جہاد میں ایک مسلمان کا دس سے مقابلہ کی بجائے ایک مسلمان کا دو کافروں سے مقابلہ کا حکم دیا گیا.** اسی طرح رمضان کی راتوں میں کھانے پینے کی اجازت دی جانا وغیرہ.

(ب) **آسان حکم کو مشکل حکم سے منسوخ کرنا:** جیساکہ شراب کی حرمت کے تدریجی مراحل، پہلے شراب کا صرف نمازوں کے اوقات میں حرام ہونا، اور پھر کلی طور پر اسے حرام قرار دیا جانا: ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ ﴾ (المائدة: 90)

(ج) **ناسخ اور منسوخ دونوں حکم برابر ہونا:** جیساکہ تحویل قبلہ ہے، کہ بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ کو قبلہ قرار دیا جانا: ﴿ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ﴾ (البقرة: 150)

نسخ کی شکلیں:

(ا) **تلاوت اور حکم دونوں ہی منسوخ ہو جانا:** ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: (كَانَ فِيمَا أُنْزِلَ فِي اَلْقُرْآنِ: عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَعْلُومَاتٍ يُحَرِّمْنَ, ثُمَّ نُسِخْنَ بِخَمْسٍ مَعْلُومَاتٍ, فَتُوُفِّيَ رَسُولُ اَللَّهِ - ﷺ -وَهِيَ فِيمَا يُقْرَأُ مِنَ اَلْقُرْآنِ) (مسلم).

(ب) **تلاوت باقی رہنا اور صرف حکم نسخ ہو جانا:** جیساکہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ﴾ (الانفال: 65) **یہ آیت اس سے بعد والی آیت سے منسوخ ہے:** ﴿ الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا ۚ فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴾ (الانفال: 66) چنانچہ سابقہ آیت کا لفظ باقی ہے، جبکہ اس کا حکم منسوخ ہو چکا ہے.

(ج) **حکم باقی رہنا اور صرف تلاوت منسوخ ہو جانا: ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:** مجھے ڈر ہے لمبا عرصہ گذرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہے کہ مجھے اللہ کی کتاب میں رجم (سنگساری) کی سزا نہیں ملی، اور پھر ایک فریضہ چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں، خبردار! اگر زانی شادی شدہ ہو، اور گواہی قائم ہونے، حمل ٹھہرنے یا اعتراف کرنے سے دعوی ثابت ہو جائے تو رجم (سنگسار) کرنے کی سزا برحق ہے، اور میں خود قرآن میں پڑھا ہے: (الشَّيخُ والشَّيخَةُ إذَا زَنَيا فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ) اور رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا اور ہم نے بھی ان کے بعد رجم کیا" (ابن ماجه:2083، وصححه الألباني).

اور اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سورۃ الأحزاب کے متعلق فرماتے ہیں: "لَقَدْ رَأَيْتُهَا وَإِنَّهَا لَتُعَادِلُ سُورَةَ الْبَقَرَةِ ، وَلَقَدْ قَرَأْنَا فِيهَا : (الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوهُمَا الْبَتَّةَ نَكَالًا مِنَ اللهِ وَاللهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ"میں نے دیکھا که یه سورت البقرة کے برابر تهي، اور هم نے اس میں یه پڑها: (بڑي عمر کے مرد وعورت اگر زنا کریں تو انهیں حتمي طور پر سنگسار کیا جائے، جو الله کي طرف سے سزا هے، اور الله تعالی بهت غالب حکمت والا هے) رواه احمد (21207)، وابن حبان (4428) وصححه الألباني.

منسوخ شدہ آیات کی تعداد :

علامہ سیوطی نے منسوخ شدہ آیات کو شمار کیا ہے اور ان کی تعداد 20 آیتیں بتائی ہے (الإتقان" (3/77)، لیکن علماء کا ان بعض آیات میں اختلاف ہے کیا وہ منسوخ ہیں یا نہیں؟ لہٰذا منسوخ شدہ آیات کی تعداد مختلف فیہ ہے، اور اس میں علماء کا اجتہاد ہے. وانظر " تكملة أضواء البيان " (9/195) .

كتب الناسخ والمنسوخ :

ناسخ الحديث ومنسوخه لابن شاهين ، سنة الوفاة : 385

الاعتبار في الناسخ والمنسوخ من الآثار لمحمد بن موسى الحازمي ، سنة الوفاة : 584

إعلام العالم بعد رسوخه بناسخ الحديث ومنسوخه » لأبي الفرج ابن الجوزي، سنة الوفاة : 597

قرآن کی جمع، تدوین اور حفاظت

جمع قرآن سے مراد قرآن کریم کا حفظ و کتابت کرنا۔ اور تدوین سے مراد اس کو کتابی صورت میں ترتیب دینا ہے۔ جمع قرآن کا مقصد یہی تھا کہ جس طرح قرآن مجید آپ ﷺ پر اترا ہے اور جس طرح آپ نے اسے پڑھا یا سکھایا ہے اسے لکھ کر محفوظ کر لیا جائے۔ یہ اللہ کا حکم تھا تاکہ مستقبل میں ممکنہ اختلاف جو قراءت یا اس کے الفاظ سے پیدا ہو سکتا ہے وہ نہ ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ نے خود بھی اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی مگر اس حفاظت کا کام صحابہ رسول اور امت کے قراء و حفاظ سے بھی لیا۔

جمع قرآن کی دلیل:

- صحیحین میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ آپ ﷺ قرآن کی تنزیل میں سخت شدت محسوس کیا کرتے۔ اور اپنے ہونٹوں کو حرکت دیا کرتے تھے، جس پر اللہ تعالی فرمان نازل ہوا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ . إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ آپ قرآن پاک کو حاصل کرنے میں جلدی مت کیا کیجئے یقیناً اس قرآن کو جمع کرنا اور اسے پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے(القیامة: 16-17)۔ چنانچہ جبریل امین آپ ﷺ کے پاس جب آتے تو آپ غور سے سنا کرتے۔ پھر جب وہ چلے جاتے تو آپ اسے ویسا ہی پڑھ لیتے جیسا انہوں نے اسے پڑھا ہوتا۔

جمع قرآن کے چار ادوار:

پہلا دور: عہد نبوی میں جمع قرآن:

عہد نبوت میں قرآن کی جمع اور حفاظت کے دو بڑے انداز تھے: حفظ اور کتابت۔

حفظ: وحی کے آغاز سے ہی اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو قرآن مجید حفظ کروانے کی تسلی دی تھی: ﴿سَنُقْرِؤُکَ فَلَا تَنسَى﴾ (الاعلی:4) "ہم آپ کو پڑھوا دیں گے کہ آپ نہیں بھولیں گے" اسے آپ ﷺ کے قلب اطہر پر اتار کر محفوظ کر دیا گیا۔ ﴿إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ "یقیناً اسے جمع کرنا اور اسے پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے۔" (القیامة: 17)، مزید یہ کہ ہر سال جبریل امین کے ساتھ آپ ﷺ نازل شدہ حصے کا باقاعدہ دور بھی کرتے۔ حدیث میں ہے: أَنَّ جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلاَمُ ۔كَانَ يُعَارِضُ النَّبِيَّ ﷺ بِالْقُرآنِ فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةٍ، فَلَمَّا كَانَ الْعَامُ الَّذِیْ قُبِضَ فِيْهِ عَارَضَهُ مَرَّتَيْنِ) (صحیح بخاری: 4998) جبریل امین ہر سال آپ ﷺ کے ساتھ قرآن مجید کا ایک مرتبہ دور کیا کرتے۔ جس سال آپ ﷺ کا انتقال ہوا، جبریل امین نے آپ ﷺ کے ساتھ دو مرتبہ دور کیا۔

اور حفظ کا یہ سلسلہ صرف نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے خاص نہ تھا، بلکہ آپ کے صحابہ کرام بھی اس میں پیش پیش تھے، صحابہ کرام وصحابیات کی بڑی تعداد نے نہ صرف اسے یاد کیا بلکہ لکھا بھی اور غور و تدبر کرنا بھی سیکھا۔ اور نبی کریم ﷺ بھی صحابہ کی حوصلہ افزائی فرماتے: جیسا کہ آپ نے ابو موسی الاشعری کی تلاوت سن کر فرمایا: (لَوْ رَأَيْتَنِيْ وَأَنَا أَسْتَمِعُ لِقِرَائَتِکَ الْبَارِحَةَ! لَقَدْ أُوْتِيْتَ مِزْمَاراً مِنْ مَزَامِيْرِ آلَ دَاؤدَ)۔ اگر تم دیکھتے، تو آج رات میں نے تمہاری تلاوت سنی، تم تو آل داؤد کی نغمگی عطا کئے گئے ہو۔ (صحیح مسلم)، نیز صحابہ کی بڑی تعداد اطراف مدینہ میں جا کر قریہ قریہ اور بستی بستی قرآن سکھاتی رہی۔

کتابت:

حفاظت قرآن کے لیے نبی اکرم ﷺ نے قرآن کی کتابت کا بھی اہتمام کیا۔ کسی آیت کے نزول کے بعد آپ ﷺ کاتبین وحی کو ہدایت فرماتے کہ یہ آیات فلاں سورہ کی فلاں آیت کے سرے پر لکھو۔ اس طرح قرآن کریم کے ایک ایک حرف، آیت، سورۃ کو کتابت کے

ذریعے آپ ﷺ نے صحیفوں اور سطور میں ترتیب دے کر محفوظ کر دیا۔ امام حاکمؒ مستدرک میں فرماتے ہیں: جُمِعَ الْقُرْآنُ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ، أَحَدُها بِحَضْرَةِ النَّبِيِّ، وَالثَّانِيَةُ: بِحَضْرَةِ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، وَالْجَمْعُ الثَّالِثُ فِي زَمَنِ عُثْمَانَ۔ قرآن کریم تین بار جمع کیا گیا، پہلی بار آپ ﷺ کی موجودگی میں، دوسری بار سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی موجودگی میں اور تیسری بار سیدنا عثمانؓ کے عہد میں۔ اس کتابت کے بارے میں سیدنا زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں: قرآن کی جو آیات نازل ہوتیں آپ ﷺ مجھے لکھوا دیتے۔ اس کے بعد میں آپ ﷺ کو سناتا، اگر اصلاح کی ضرورت ہوتی تو آپ ﷺ اصلاح فرما دیتے۔ پھر اس کے بعد اس لکھے ہوئے کو میں لوگوں کے سامنے لاتا۔ جو کچھ بھی لکھا جاتا وہ آپ ﷺ کے گھر میں رکھ دیا جاتا تھا۔ اس دور میں قرآن کاغذوں پر لکھا جاتا نہ ہی باقاعدہ مصحف کی صورت میں تھا، بلکہ متفرق طور پر پتھر کی تختیوں، چمڑے کے ٹکڑوں، درخت کی چھالوں اور چوڑی ہڈیوں وغیرہ پر لکھا جاتا تھا۔(مناہل العرفان للزرقانی: 239) اسی لئے تو سیدنا زیدؓ کا یہ کہنا ہے: "قبض النبی ﷺ ولم یکن القرآن جمع فی شئ۔ آپ ﷺ کا انتقال ہوا اور قرآن کریم کسی بھی شے میں جمع نہ تھا۔(فتح الباری 9/9).

عہد رسالت میں ایک نسخہ تو وہ تھا جو نبی اکرم ﷺ کے پاس تھا، اس کے علاوہ صحابہؓ نے خود اپنے نسخے بھی تیار کر رکھے تھے۔ جن میں خصوصاً: عبد اللہ بن مسعودؓ، علیؓ، عائشہؓ، ابی بن کعبؓ، عثمان بن عفانؓ، تمیم الداریؓ، ابوالدرداءؓ، ابوایوب انصاریؓ، عبد اللہ بن عمرؓ، عبادہ بن صامتؓ، اور زید بن ثابتؓ شامل ہیں۔ آپ ﷺ نے انہی صحابہ کو قرآن کریم دشمن کی زمین میں لے جانے سے منع فرمایا۔ (صحیح بخاری: 409/1) - نیز قرآن کریم کے علاوہ ان اوراق پر کچھ اور لکھنے سے بھی آپ ﷺ صحابہ کرام کو منع فرماتے: (مَنْ كَتَبَ عَنِّي غَيْرَ الْقُرْآنِ فَلْيَمْحُهُ وَحَدِّثُوْا عَنِّيْ وَلاَ حَرَجَ)۔ مجھ سے قرآن کے علاوہ جس کسی نے کچھ لکھا ہے تو وہ اسے مٹا دے ہاں مجھ سے حدیث بیان کر سکتے ہو اس میں کوئی حرج نہیں۔

آپ ﷺ کی زیر نگرانی جو کتابت قرآن ہوئی وہ سبعہ حروف پر مشتمل تھی۔ اس کی آیات کی ترتیب توقیفی تھی۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے جو امام نسائیؒ اپنی سنن کبری میں روایت فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: (لَمَّا نَزَلَتْ آخِرُ آيَةٍ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ {وَاتَّقُواْ يَوْماً تُرْجَعُونَ فِيْهِ إِلَى اللهِ۔۔۔} (البقرۃ: 281) تو جناب جبریلؑ نے آپ ﷺ سے فرمایا: یا محمد! ضَعْهَا عَلَى رَأْسِ ثَمَانِيْنَ وَمِئَتَيْ آيَةٍ مِنْ سورۃ البقرۃ۔ اللہ کے رسول ﷺ! آپ اسے سورہ بقرہ کی آیت نمبر 280 کے بعد رکھیے)۔

زمانہ نبوی میں قرآن کریم ایک ہی مصحف میں جمع کیوں نہ ہو سکا؟

اس کے کئی جواب علماء نے دیئے ہیں۔

1۔ قرآن کریم یکبارگی نہیں بلکہ تئیس سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ اس لئے اسے ایک مصحف میں جمع کرنا ممکن نہ تھا۔

2۔ آپ ﷺ نے اسے اس لئے بھی ایک ہی مصحف میں جمع نہیں فرمایا کیونکہ قرآن میں نسخ واقع ہو رہا تھا اگر آپ ﷺ اسے جمع کر دیتے پھر کچھ حصے کی تلاوت منسوخ ہو جاتی تو یہ اختلاف اور دین میں اختلاط کا سبب بنتا۔ (البرہان للزرکشی 235/1)

3۔ قرآن کریم میں آیات وسور کی ترتیب نزولی نہیں۔ اگر اس وقت قرآن ایک مصحف میں جمع کر دیا جاتا تو یہ ترتیب ہر نزول کے وقت ہی تبدیلی کا سامنا کرتی۔ اس لئے صحابہ کرام کے مابین جب کسی آیت میں اختلاف ہوتا تو وہ مکتوب قرآن کی بجائے رسول اکرم ﷺ

سے ہی رجوع کرتے۔ وفات رسول اور بعض قراء صحابہ کرام کی شہادت کے بعد یہ ضرورت شدت سے محسوس کی گئ کہ ایک ہی مصحف میں قرآن جمع کرلیا جائے اور یہ سعادت سیدناابوبکرؓ کے حصے میں آئی۔

4۔ آپ ﷺ کے عہد میں قرآن کریم مختلف پارچات پر مکتوب اور الگ الگ تھا۔ آپ ﷺ کو بھولنا بھی نہیں تھا، ہاں یہ امکان آپ کی وفات کے بعد دوسروں سے تھا۔ اس لئے آپ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام نے اسے ایک ہی مصحف میں لکھنے کی جلد از جلد کوشش کی۔

دوسرا دور: عہد خلافتِ صدیقي میں جمع قرآن:

اس دور میں جمع قرآن کی تفصیلات سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”جنگ یمامہ کے فوراً بعد 12ھ کو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک روز پیغام بھیج کر مجھے بلوا بھیجا۔ میں ان کے پاس پہنچا تو وہاں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے فرمایا: عمر نے آکر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے ستر حفاظ شہید ہو گئے ہیں، اور اگر مختلف مقامات پر اسی طرح حفاظِ قرآن شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کا ایک بڑا حصہ ناپید (ضائع) نہ ہو جائے۔ لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ قرآن کو جمع کر لینا چاہئے۔ میں نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: جو کام نبی ﷺ نے نہیں کیا ہم وہ کیسے کریں؟ عمر نے جواب دیا: خدا کی قسم! یہ کام کرنا ہی زیادہ بہتر ہے۔ اس کے بعد عمرؓ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ میرا بھی شرح صدر ہو گیا، اور اب میری بھی رائے وہی ہے جو عمرؓ کی ہے۔ اس کے بعد خلیفہ رسول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: زید! تم نوجوان ہو اور سمجھ دار بھی۔ ہمیں تمہارے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے۔ تم نے رسول اللہ ﷺ پر اترنے والی وحی کو لکھا ہے۔ (فتَتَبَّعِ القرآن فأجمعه) تو تم قرآن کو تلاش کر کے اسے جمع کرو۔

کاتب وحی سیدنا زیدؓ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم دیتے تو ایسا کرنا میرے لئے آسان ہوتا۔ چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کیا اور کھجور کی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کو جمع کر ڈالا۔ جس کے صحیفے سیدنا ابوبکرؓ کے پاس ان کی وفات تک رہے۔ بعد میں یہی صحیفے اُم المؤمنین سیدہ حفصہ بنت عمرؓ کے پاس آ گئے۔ (صحیح بخاری ،کتاب التفسیر باب قوله تعالی لقد جائکم رسول من أنفسكم)

خلیفہ رسول ابوبکرؓ کے اس عمل کو صحابہ رسول نے اور تمام امت نے سراہا، اور امت پر ایک بڑا احسان سمجھا۔ سیدنا علیؓ بن ابی طالب نے فرمایا: "أَعْظَمُ النَّاسِ فِي الْمَصَاحِفِ أَجْراً أَبِي بَكْرٍ، رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَى أَبِي بَكْرٍ هُوَ أَوَّلُ مَنْ جَمَعَ كِتَابَ اللّٰهِ"۔ ”مصاحف کو جمع کرنے میں سب سے زیادہ اجر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے ہے، اللہ تعالی کی ان پر رحمت ہو وہ امت کے پہلے فرد ہیں جنہوں نے کتاب اللہ کو جمع کیا“. (المصاحف لابن ابي داود ص(154).

جمع قرآن کا طریقہ:

قرآن کو جمع کرنے کے لئے سیدنا زیدؓ بن ثابت کی سربراہی میں ایک کمیٹی قائم کی گئ، جس میں جلیل القدر صحابہؓ شامل تھے۔ ابتداءً سیدنا ابوبکرؓ نے جمع قرآن کے سلسلے میں ایک اہم ہدایت دی جس پر عمل کے لئے سیدنا عمر فاروق کو سیدنا زیدؓ کے ساتھ لگادیا۔ خلیفہ رسول ابوبکرؓ نے سیدنا عمرؓ اور زیدؓ سے فرمایا: اُقعُدَا عَلَى بَابِ الْمَسْجِدِ، فَمَن جَاءَكُمَا بِشَاهِدَينِ عَلى شَيءٍ مِنْ كتابِ اللّٰهِ

فَاكْتُبَاهُ۔ "دونوں مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤتو جو تمہارے پاس قرآن کی کسی آیت پر دو گواہ لائے تو اسے لکھ لو۔(المصاحف لابن ابی داؤد: 12، فتح الباری 14/9)

عبدالرحمٰنؒ بن حاطب کہتے ہیں: قَدِمَ عُمَرُ فقال: مَنْ تَلَقَّى مِن رسولِ اللهِ ﷺ شيئًا مِنَ القرآنِ فَلْيَأتِ بِهِ، وَكَانوا يَكْتُبُون ذَلكَ فِي المُصْحَفِ وَالألواحِ وَالعُسُبِ، وكاَن لا يَقبَلُ مِن أحدٍ شيئا حَتى يَشْهَدَ شَاهِدَانِ۔ سیدنا عمر تشریف لائے اور فرمایا: جس نے رسول اللہ ﷺ سے قرآن کا کوئی حصہ حاصل کیا ہو تو وہ اسے لے آئے۔ صحابہ قرآن مجید کو صحیفوں، تختیوں اور کھجور کی چھالوں پر لکھا کرتے تھے۔آپ یہ تحریر دو گواہوں کے پیش کر دینے کے بعد قبول کرتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جمع قرآن کے لئے سب سے پہلے تو یہ اعلان عام کر دیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی لکھی ہوئی کوئی آیت بھی ہو وہ سیدنا زیدؓ کے پاس لے آئے۔جب کوئی لکھی ہوئی آیت لے آتا تو وہ چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے :

1۔اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے۔

2۔ کمیٹی کے ممبر سیدنا عمرؓ فاروق بھی حافظ قرآن تھے جو اپنے حافظہ سے اس کی توثیق کرتے تھے۔

3۔ کوئی لکھی ہوئی آیت اس وقت تک قبول نہ کی جاتی جب تک دو قابل اعتماد گواہ یہ گواہی نہ دے دیں کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے لکھی گئی تھی۔

4۔بعد میں ان کی لکھی ہوئی آیات کاان مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے۔

جمع کردہ نسخہ کا نام اور خصوصیات:

اس کمیٹی نے انتہائی احتیاط اور سخت محنت کے بعد قرآن کو ایک سال کی مدت میں جمع کیا، جسے تمام صحابہ کرام نے اتفاقاً قبول کیا، اور یوں امت کا اس پر اجماع ہو گیا۔اس نسخہ کی خصوصیات حسب ذیل تھیں :

1۔ نسخہ میں قرآنی آیات کی ترتیب آپ ﷺ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق تھی، لیکن سورتیں مرتب نہ تھیں، بلکہ ہر سورت الگ اور علیحدہ صحیفہ میں تھی، جن کی ترتیب عہد عثمانی میں ہوئی۔اس نسخہ کا نام مصحف اُم رکھا گیا۔

2۔اس نسخہ میں ساتوں حروف جمع تھے۔

3۔ یہ نسخہ خط حیری میں لکھا گیا تھا۔

4۔اس میں صرف وہ آیات لکھی گئیں جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس میں آیۃالرجم نہیں لکھی گئی، کیونکہ اس کی تلاوت منسوخ تھی مگر حکم باقی تھا۔

5۔ یہ امت کے لئے ایک ایسا متفقہ مرتب نسخہ تھا جو اسے انتشار سے بچا گیا۔اسی لئے سیدنا زیدؓ نے تمام گواہوں کی موجودگی میں اس کا اعلان کیا۔ جس کے صحیح ہونے کی سب نے بلااعتراض گواہی دی۔

سیدنا زیدؓ نے تکمیل مصحف کے بعد اسے خلیفہ رسول ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا، جو ان کے پاس وفات تک رہا۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آگیا، ان کی وفات کے بعد یہ مصحف ام المؤمنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس وقت تک رہا جب عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے طلب کرکے منتخب کمیٹی کے ذریعے نئے نسخے تیار کروائے، اور پھر اسے واپس لوٹا دیا جو ان کی وفات کے بعد سیدنا

ابن عمر رضی اللہ عنہ کے ذریعے اس وقت کے امیر مدینہ : مروان بن الحکم کے پاس آیا تو مروان نے یہ سوچ کر کہ مبادا اس میں کوئی ایسی بات ہو جو نسخہ عثمانی سے مختلف ہو اسے تلف (ضائع) کر دیا۔

تیسرا دور: خلافتِ عثمانی میں جمع قرآن :

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسلام عرب سے نکل کر روم اور ایران کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا۔ نئے مسلمان جو عجمی تھے مجاہدین اسلام یا مسلمان تاجروں سے قرآن سیکھتے، جن کی بدولت انہیں اسلام کی نعمت حاصل ہوتی۔ قرآن سبعہ حروف میں نازل ہوا تھا۔ صحابہ کرامؓ نے نبی اکرم ﷺ سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا۔ اس لئے ہر صحابی نے اپنے شاگرد کو اسی طرح پڑھایا جس طرح اس نے خود نبی اکرم ﷺ سے سیکھا تھا۔ یوں قراءتوں کا اختلاف دور دراز ممالک تک پہنچ گیا، اور لوگوں میں جھگڑے پیدا ہونے لگے۔ زیادہ خرابی اس لئے بھی پیدا ہوئی کہ سوائے ''مصحف ام'' کے پورے عالم اسلام میں کوئی ایسا معیاری نسخہ نہ تھا جو امت کے لئے نمونہ و حجت ہو۔ امیر المؤمنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ خود بھی اس خطرے کا احساس کر چکے تھے۔ کیونکہ انہوں نے مدنی بچوں میں ان کے اساتذہ کی اختلاف قراءت کے اثرات کو بھانپ لیا تھا۔ سیدنا عثمانؓ اپنی تقاریر میں ان سے فرما بھی چکے تھے : أَنْتُمْ عِنْدِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ فَتَلْحَنُونَ، فَمَنْ نَأَى عَنِّيْ مِنَ الأَمْصَارِ أَشَدُّ اخْتِلاَفاً، وَأَشَدُّ لَحْناً، اِجْتَمِعُوْا يا أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ، وَاكْتُبُوْا لِلنَّاسِ إِمَاماً (المصاحف: 29) تم میرے پاس ہوتے ہوئے بھی اختلاف کرتے ہو اور لحن بھی، تو جو مجھ سے دور علاقوں میں آباد ہیں ان کا اختلاف اور لحن تو اور زیادہ ہوگا۔ اے اصحاب محمد ! اتفاق کر لو اور لوگوں کے لئے ایک امام لکھ ڈالو۔

لہٰذا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے صحابہؓ کے سامنے یہ رائے رکھی کہ مصحف اُم کو سامنے رکھ کر ایک ایسا مصحف تیار کیا جائے جو صرف قریش کی لغت پر ہو۔ پھر اس کی نقول بنوا کر تمام عالم اسلام میں پھیلا دی جائیں۔ تمام صحابہؓ نے خلیفہ راشد سیدنا عثمانؓ کی اس اجتہادی رائے کی بھرپور تائید کی، کہ قرآن صرف قریش کے لہجے میں لکھا اور جمع کیا جائے، کیونکہ آپ ﷺ قریشی تھے، آپ ﷺ افصح العرب تھے، اور قریش ہی کی زبان و لہجے میں قرآن اترا تھا۔ (كتاب المصاحف: لابن ابی داؤد: 22)

اس صورتحال میں سیدنا عثمانؓ نے سن 25ھ میں وہ عظیم کارنامہ سرانجام دیا جس کی تفصیل سیدنا انسؓ کی روایت سے صحیح بخاری میں یوں بیان ہوئی ہے: سیدنا حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے۔ وہ اہل شام و عراق کے ساتھ آرمینیہ اور آذربیجان کو فتح کرنے کے لئے جہاد کر رہے تھے۔ انہوں نے شامی و عراقی قراء میں اختلافات دیکھے تو پریشان ہو گئے۔ انہوں نے سیدنا عثمانؓ سے عرض کی: اس امت کی حفاظت کیجیے اس سے پہلے کہ ان کا اپنی مقدس کتاب میں ویسا ہی اختلاف ہو جیسا یہود ونصاری کے یہاں ہو چکا ہے۔ سیدنا عثمانؓ نے سیدہ حفصہؓ ام المؤمنین سے مصحف منگوایا تاکہ اس کی نقول تیار کر لیں۔ پھر امیر المؤمنین نے زید بن ثابتؓ، عبد اللہ بن زبیرؓ، سعید بن ابی العاصؓ اور عبد الرحمٰن بن حارثؓ بن ہشام کو قرآن لکھنے کا حکم دیا۔ جو انہوں نے اسے مختلف صحیفوں میں لکھ ڈالا۔ اس موقع پر سیدنا عثمانؓ نے ان تینوں قریشیوں سے فرمایا: جب تم اور زید کتابت کے دوران کسی بھی چیز میں اختلاف کرو تو پھر قرآن کو قریشی زبان میں لکھنا، اس لئے کہ قرآن انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ سو انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حتی کہ جب چند مصاحف لکھ لئے گئے تو سیدنا عثمانؓ نے اصل نسخہ ام المؤمنین کو واپس لوٹا دیا، اور ہر صوبہ میں ان لکھے ہوئے مصاحف کی ایک ایک نقل بھجوا دی۔ ساتھ ہی یہ حکم جاری کیا کہ اس قرآن کے سوا اب ہر صحیفہ یا مصحف جلا دیا جائے۔

جمع عثماني كي خصوصيات:

1. تمام سورتوں کو ترتیب سے ایک ہی مصحف میں لکھا گیا ۔(مستدرک الحاکم)
2. نہ صرف مصحف ام کو سامنے رکھا گیا بلکہ نقول تیار کرتے وقت اس کی کتابت وخط کا خصوصی خیال کیا۔ جہاں پر بھی تھوڑا سا اختلاف سیدنا زید اور کمیٹی کے مابین ہوا وہیں پر قریشی لہجہ اور قریشی لغت کو بنیاد بنا کر اس کی تصحیح کر دی گئی۔
3. اس مصحف کو لکھوانے کی اصل غرض یہ تھی کہ مسلمانوں کو ایک ہی لہجہ اور لغت پر اکٹھا کر دیا جائے، اور باقی لہجات اور لغات کو ختم کیا جائے، تاکہ کسی طرح کا اختلاف نہ رہے۔
4. اس کے خط میں اس بات کی رعایت رکھی گئی کہ وہ ساتوں حروف اس میں سما جائیں جو عرضہ اخیرہ میں موجود تھیں۔اور قراءات کی مختلف صورتیں بھی ممکن ہو سکیں۔
5. اختلاف قراءات میں صرف اس صورت پر اکتفاء کیا گیا جو متواتر تھی۔ باقی منفرد قراءات کو جو متواتر نہ تھیں انہیں نظر انداز کیا گیا۔
6. بعض ذاتی مصاحف میں صحابہ کرام کے اپنے وضاحتی بیانات یا الفاظ کی تشریح کو بھی غیر اہم قرار دیا گیا۔
7. وہ الفاظ وآیات جن کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی اسے بھی نظر انداز کیا گیا، اس لئے کہ عرضہ اخیرہ میں یہ شامل نہیں تھیں۔
8. اس مصحف امّ کی ایک سے زائد نقول تیار کیں جن کی تعداد، روایات میں پانچ بھی ملتی ہے اور سات بھی ۔(فتح الباری: 17/9)
9. یہ معیاری نسخے تیار کروانے کے بعد سیدنا عثمانؓ نے وہ تمام انفرادی نسخے نذر آتش کر دیے جو مختلف صحابہ مثلاً: ابی بن کعبؓ، علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ کے پاس تھے، تاکہ تمام مسلمان ایک ہی نسخے پر جمع ہوں، اور اختلاف کی گنجائش نہ رہے.
10. ان نسخوں کو مدینہ کے علاوہ مکہ، شام، یمن، کوفہ وبصرہ، بحرین وغیرہ بھجوا دیا گیا۔
11. ان نسخوں کو مرتب کرتے وقت کلمات وحروف کے لکھنے کا جو خاص طرز وانداز اختیار کیا گیا علماء نے اس کا نام رسم مصحف رکھا۔اور اس پسندیدہ رسم الخط کو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب کرتے ہوئے رسم عثمانی یا خط عثمانی کا نام دیا گیا۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے اس عمل کے بارے فرماتے تھے:

لوگو! عثمان کے بارے میں غلو سے کام نہ لو۔ بلکہ ان کے حق میں خیر کہو۔ بخدا انہوں نے مصاحف کے بارے میں جو کچھ کیا ہم صحابہ سے مشورے سے ہی کیا۔ انہوں نے فرمایا: میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک ہی مصحف پر جمع کر دیں۔ جس سے تفریق ہو نہ اختلاف۔ ہم سب نے کہا: بہت ہی بہترین رائے ہے".

سیدنا علیؓ فرماتے ہیں: "اللہ کی قسم اگر میں مسلمانوں کا والی بنتا تو میں بھی وہی کرتا جو عثمانؓ نے کیا۔"

چوتھا دور: صوتی وطباعتی جمع:

تلاوت کے بعض احکام جن میں قلقلہ، رَوم، إشمام، إخفاء، إدغام، إقلاب اور إظہار وغیرہ کی پابندی تلاوت کرنے والے کی لئے ضروری ہے۔ اس لئے قرآن پاک کی تحریر میں ان احکام کا لکھنا تو ممکن تھا، مگر اس کی صحیح ادائیگی ناممکن ہے، صحیح ادائیگی کے لیے اسے متقن حفاظ مشائخ سے براہ راست سیکھنے اور حاصل کرنے کی ضرورت ہے: امام شافعی فرمایا کرتے: مَنْ تَفَقَّهَ مِنْ بُطُونِ الكُتُبِ ضَيَّعَ الأَحْكَامَ۔ جو کتابوں سے فقیہ بنتا ہے وہ بہت سے احکام کھو بیٹھتا ہے۔(الفقيه والمتفقه: 97/2)

مشہور ائمہ حفاظ قرآن اپنے حفظ کی تلقی (to aquire knowledge from scholar) کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ مثلاً: سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: واللہ! میں نے رسول اللہ ﷺ کے دہن مبارک سے ستر سے اوپر سورتیں حاصل کی ہیں۔ اور یہ بھی بیان کرتے ہیں: میں باقی سورتیں کس سے حاصل کیں۔ أَخَذْتُ بَقِيَّةَ القرآنِ عن أَصْحَابِه۔ باقی قرآن پاک میں نے آپ ﷺ کے صحابہ سے لیا۔ اس تلقی کا مقام ومرتبہ کیا ہے؟ اس کا ادراک انہیں اس حد تک تھا کہ جب انہیں کسی سورت کے بارے میں پوچھا جاتا تو صاف فرمادیتے میں نے یہ سورت نبی کریم ﷺ سے نہیں سنی۔ اور اس صحابی کا بتادیتے جنہوں نے آپ ﷺ سے وہ سورت سنی ہوتی۔

نبی کریم ﷺ فارغ التحصیل قراء طلبہ کو نومسلم کی تعلیم کے لئے مقرر فرماتے، خلفاء راشدین نے مفتوحہ علاقوں میں بھی یہی سنت جاری رکھی۔ سیدنا عثمانؓ نے مکتوب مصاحف کو جن سات علاقوں میں بھیجا ان کے ساتھ ایک مقرئ بھی روانہ فرمایا۔ یہ سب قراءت قرآن کی تلقی کا اہتمام تھا جو بالمشافہہ سیکھنے سکھانے کا تھا، جو ۔۔وللہ الحمد۔۔ آج تک جاری وساری ہے۔

قرآن کے سات حروف

اہلِ عرب کے مختلف قبائل تھے، اگرچہ تمام قبائل کی زبان عربی تھی، لیکن بعض قبائل کا دوسرے قبائل سے لہجوں میں فرق ہوتا تھا، چنانچہ ہر قبیلہ والوں کے لیے اپنے لہجے میں قرآن پڑھنے میں آسانی تھی، اسی اختلاف کے پیشِ نظر اللہ تعالی نے قرآن کریم کی تلاوت میں آسانی کے لیے، امت پر یہ احسان فرمایا کہ قرآن کریم کے بعض الفاظ کو مختلف طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دی، جیساکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: (أَقْرَأَنِي جِبْرِيلُ عَلَى حَرْفٍ، فَرَاجَعْتُهُ، فَلَمْ أَزَلْ أَسْتَزِيدُهُ وَيَزِيدُنِي حَتَّى انْتَهَى إِلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ) (جبرئیل نے مجھے قرآن ایک حرف میں پڑھایا، تو میں بار بار زیادہ حروف کا مطالبہ کرتا رہا، یہاں تک کہ سات حروف تک پڑھنے کی اجازت دی) (متفق عليه)، مزید ارشادِ نبوی ہے: (إنَّ هذا القُرْآنَ أُنْزِلَ علَى سَبْعَةِ أحْرُفٍ، فاقْرَؤُوا ما تَيَسَّرَ منه) (یہ قرآن سات حروف میں نازل ہوا ہے، اس میں سے جو بھی آسان ہو پڑھ لو) (متفق عليه)، ان احادیث کو صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد نے روایت کیا ہے، حتی کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر صحابہ سے اس کی گواہی طلب کی تو بے شمار صحابہ نے اس کی گواہی دی۔

کیا یہ سات حروف ہی سات قراءات ہیں؟

اس موضوع پر علماء کا اختلاف ہے: چنانچہ بعض علماء کا کہنا ہے کہ سات حروف سے مراد سات قراءات ہیں، لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے، کیونکہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں قرآن جمع کرنے کا مقصد یہی تھا کہ قرآن کی تلاوت میں متعدد حروف کی وجہ سے لوگوں ـ خصوصاً اہلِ عجم ـ میں جو اختلاف پیدا ہو رہے تھے، ان اختلافات کو ختم کیا جائے، چنانچہ حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو ارمینیا اور آذربیجان میں قراء کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کے خطرناک نتائج کی تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: (يَا اَمِيرَ الْمُؤمِنِينَ ! اَدْرِكْ هَذِهِ الْأُمَّةَ قَبْلَ اَنْ يَخْتَلِفُوا فِي الْكِتَابِ اخْتَلَافَ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارَى) (امیر المؤمنین! امت کی فکر کیجیے، اس سے پہلے کہ یہود ونصاری کی طرح یہ امت بھی قرآن میں اختلافات کا شکار ہو جائے)، جس پر عثمان رضی اللہ عنہ نے: علی بن ابی طالب، طلحہ، اور زبیر جیسے جلیل القدر صحابہ سے مشورہ کے بعد: زید بن ثابت، عبداللہ بن الزبیر اور سعید بن العاص رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ قرآن کریم کو ایک حرف (لہجہ) میں جمع کریں، جو کہ قریش کا لہجہ ہے، اور باقی تمام لہجوں کو ختم کیا جائے، تاکہ امت کسی انتشار کا شکار نہ ہو جائے، چنانچہ انہوں نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمع شدہ قرآن کو بنیاد بناتے ہوئے قرآن کو ایک حرف پر جمع کیا، اور پھر یہی نسخہءِ قرآن تمام ملکوں میں بھیجا، اور اس کے علاوہ تمام نسخے ختم کر دیے (صحيح البخاري: 4604).

جبکہ سات قراءات اور دس قراءات یہ وہی نسخہءِ قرآن ہے جسے عہدِ عثمانی میں جمع کیا گیا تھا۔

اس لیے راجح قول یہ ہے کہ سات حروف سے مراد ایک ہی معنی کے لیے عرب کی زبانوں کے مختلف الفاظ ہیں، جس کا معنی یہ ہے کہ اگر کسی معنی کے لیے عربوں کی مختلف لغات ہوں تو اس معنی کی تعبیر کے لیے قرآن میں مختلف الفاظ بیان ہوتے ہیں، مثلاً: **هَلُمَّ، تَعَالَ، اَقْبِل**، ان تمام الفاظ کا معنی ہے: آ جاؤ، یہ ہے اس معنی کے لیے جس کے عرب کے مختلف قبائل میں مختلف الفاظ تھے، لیکن اگر تمام قبائل کے ہاں اس معنی کے لیے ایک ہی لغت ہو تو اسے ایک ہی لفظ سے بیان کیا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ جن عرب قبائل کی زبانوں میں قرآن نازل ہوا ہے وہ یہ ہیں: قریش، ہذیل، تمیم، ازد، ربیعۃ، ہوازن، سعد بن بکر. اور بعض علماء نے ان کے علاوہ بعض دوسرے قبائل کا ذکر کیا ہے۔

قرآن کریم میں مُحْكَمْ وَمُتَشَابِه

علوم القرآن اور اصول تفسیر کے اہم ترین موضوعات میں سے محکم اور متشابہ کا موضوع ہے، جس کی علم و معرفت کے بغیر قرآن کریم کے معانی و مقاصد کا ادراک ناممکن ہے، کیونکہ قرآن کریم محکم اور متشابہ دونوں طرح کی آیات پر مشتمل ہے.

ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾ (وہی ذات ہے جس نے آپ پر وہ کتاب نازل فرمائی جس کی بعض آیات محکم ہیں، وہی اصل کتاب ہیں، اور کچھ متشابہ ہیں، جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ اور تاویل کی تلاش میں متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، جب کہ اس کی (حقیقی) تاویل تو صرف اللہ تعالی اور علم میں راسخ مقام رکھنے والے ہی جانتے ہیں، جو کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں، یہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے اور نصیحت تو صرف عقل مند ہی قبول کرتے ہیں) (آل عمران: 7).

مذکورہ آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی کچھ آیات محکم اور دوسری متشابہ ہیں، لہٰذا یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ محکم اور متشابہ کیا ہے، اور ان میں کیا فرق ہے؟

محکم اور متشابہ کی تعریف:

لغتِ عربی میں لفظِ محکم کے کئی معانی ہیں: اَحْكَمَ الاَمْرَ: کسی کام کو بڑی مہارت سے کیا، اور اَحْكَمَ الفَرَسَ: گھوڑے کے منہ میں لگام ڈالی، تاکہ وہ بے قابو نہ ہو جائے.

جبکہ لغتِ عربی میں متشابہ کا معنی: دو یا دو سے زیادہ چیزوں میں اس طرح سے مشابہت اور مشارکت ہے کہ ان دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے.

اصطلاحی طور پر محکم اور متشابہ **کی جامع ترین تعریف:**

محکم: جس کا معنی واضح ہو، اور اس کی اپنے اوپر اور دوسری چیز پر بھی دلالت کھلی اور دوٹوک ہو، کسی کے لیے اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہ ہو، اور جس سے کوئی دوسری مراد لینا ممکن نہ ہو.

جبکہ **متشابہ** وہ ہے جس کا معنی اکثر لوگوں کے لیے واضح نہ ہو، اور اس کی اپنے اوپر اور دوسری چیزوں پر دلالت دوٹوک نہ ہو، جس سے ایک سے زیادہ مراد لی جاسکتی ہو، جس میں ہر وہ چیز شامل ہے جس کا علم اللہ تعالی نے اپنے پاس رکھا ہے، جیسا کہ قیامت قائم ہونا، روح کی حقیقت، علمِ غیب وغیرہ.

محکم کی مثالیں: ﴿قُلْ هُوَ اللهُ اَحدٌ﴾ ﴿ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا ﴾﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾، جیسے: آسمان، زمین، ستارے، پہاڑ، درخت اور جانور وغیرہ ہیں، اور اس کی طرح دوسری ہزاروں آیات جو عقائد، احکام، وعظ ونصیحت اور تاریخ کے بارے میں موجود ہیں، یہ سب آیات "محکمات" ہیں، ان محکم آیات کو قرآن کریم میں "**اُمّ الکتاب**" کا نام دیا گیا ہے، یعنی یہی آیات اصل، اور مرجع و مفسر ہیں، اور یہی آیات دیگر آیات کی وضاحت کرتی ہیں.

مزید یہ کہ اللہ تعالی دوسرے مقام پر پورے قرآن ہی کو محکم کہا ہے: ﴿ كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ﴾ (ایسی کتاب جس کی آیات کو حکیم وخبیر ذات کی طرف سے محکم بنایا گیااور اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے) (هود: 1)، اور اس کے مد مقابل ایک مقام پر پورے قرآن کو متشابہ قرار دیا گیا ہے: ﴿اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ﴾ (اللہ تعالی نے سب سے اچھی بات نازل فرمائی، ایسی کتاب جو آپس میں ملتی جلتی ہے اور بار بار دہرائی جاتی ہے) (الزمر: 23).

ان دونوں آیتوں میں تمام قرآن کے لیے ایک عام حکم بیان کیا گیا ہے۔ تمام قرآن کے لیے حکمِ عام کے معنی یہ ہیں کہ قرآن مجید اپنے احکام اور الفاظ وغیرہ کے اعتبار سے محکم اور متقن ہے، اور متشابہ کے معنی یہ ہے کہ وہ کمال عمدگی تصدیق اور ہم آہنگی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے، کہ قرآن مجید کے احکام واخبار میں کسی طرح کا تضاد اور اختلاف نہیں ہے، بلکہ اس کی آیات ایک دوسری کے حق میں گواہ ہیں اور تصدیق کرتی ہیں۔ جن آیات میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے انہیں سمجھنے کے لیے تدبر اور غور فکر کی ضرورت ہوتی ہے.

متشابہات کی اقسام:

متشابہات کی تین اقسام ہیں:

1- ایسی متشابہات جن کا حقیقی علم کسی انسان کے لیے ممکن نہیں، جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، جیساکہ اللہ تعالی کی صفات کی حقیقت وکیفیت ہے، اور جنت کی نعمتوں اور جہنم کے عذاب کی شدت وغیرہ ہے.

2- دوسری وہ قسم جس کا علم حاصل کرنا ممکن ہے، اور یہ ہیں قرآن کے مشکل اور غریب الفاظ.

3- ایسی متشابہات جن کا علم صرف راسخ علماء ہی حاصل کر سکتے ہیں، اور دوسرے لوگوں سے وہ مخفی ہوتی ہیں، جن کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: (أَنَا مِنَ الرَّاسِخِينَ فِي الْعِلْمِ مِمَّنْ يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ) (میں ان راسخ علماء میں سے ہوں اس کی تفسیر جانتے ہیں) (تفسير الطبري).

متشابہات کی حکمت:

قرآن کریم میں متشابہ آیات کی حکمت یہ ہے کہ بندوں کا امتحان ہو، چنانچہ جس کے دل میں کجی اور ٹیڑھ پن ہے وہ ان متشابہ آیات سے اپنے مطلب اور مفاد کے مطابق غلط معانی لیتے ہیں، اور آیات کو ایک دوسری ٹکرا کر کر خود گمراہ ہوتے ہیں، اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، لیکن جو راسخ العلم ہیں وہ ان متشابہات کی تفسیر کے لیے محکمات کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور ایمان رکھتے ہیں کہ سبھی اللہ کی طرف سے برحق ہے، جس میں کوئی اختلاف وتناقض نہیں ہے، جیساکہ سورۃ النساء میں مشرکین کے متعلق ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا﴾ (وہ اللہ سے کوئی بات نہیں چھپائیں گے) (النساء: 42)، جبکہ سورۃ الانعام میں ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿واللَّهِ رَبِّنا مَا كُنّا مُشْرِكِينَ﴾ (اللہ کی قسم ہمارے رب! ہم مشرک نہ تھے) (الانعام: 23)، چنانچہ دل کی کجی رکھنے والا اس طرح کی آیات

کو متضاد سمجھ کر شکوک وشبہات پیدا کرکے جھٹلاتا ہے، لیکن راسخ العلم جانتے ہیں روزِ قیامت پچاس ہزار سال کا دن ہے، جس میں مختلف احوال ومراحل ہوں گے، اِنہیں حالات ومراحل کے لحاظ سے لوگوں کے حالات بھی مختلف رہیں گے. (فتاوى نور على الدرب: ابن عثيمين).

اسی طرح ﴿إِنَّا نَحْنُ نُحْيِيْ المَوْتَى﴾ ﴿إِنّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ جیسی آیات سے نصرانی اللہ کے تین ہونے کا شبہہ پیدا کرتا ہے، جبکہ راسخ العلم ایسے جمع کے صیغوں کو اللہ کی عظمت وکبریائی پر محمول کرکے ﴿وَإِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ لاَّ إِلَهَ إِلاَّ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ﴾ ﴿لَّقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ﴾ جیسی محکم آیات سے اللہ کی وحدانیت ثابت کرتا ہے. (فتاوى ابن عثيمين 186/4). یہ متشابہ نسبی کی مثالیں ہیں، جو بعض لوگوں سے مخفی ہوتی ہیں، لیکن راسخ العلم اسے جانتے ہیں.

منطوق و مفہوم

ہر لفظ اپنے اندر دو معانی رکھتا ہے، ایک وہ معنی جو لفظ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے، اور ایک وہ معنی جو اس کے ظاہر کے برعکس ہوتا ہے، اور جیسے کہ لفظ کا ظاہری معنی دلیل اور حجت ہے، ایسے ہی اس کا الٹ معنی بھی دلیل اور حجت ہے.

منطوق: وہ معنی جس پر لفظ کا نطق دلالت کرتا ہو، جس کی تین اقسام ہیں: نص، ظاہر، مؤول.

نص: جو صراحت کے ساتھ معنی پر دلالت کرتا ہو، جس میں کسی دوسرے معنی کا احتمال نہ ہو، جیسا کہ ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ (پھر تین دن کے روزے ایامِ حج میں، اور سات روزے جب تم واپس لوٹ جاؤ، یہ دس مکمل ہیں) (البقرة: 196)، چنانچہ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ کے لفظ سے اس میں 10 سے کم ہونے کا احتمال باقی نہیں رہا.

ظاهر: لفظ کا وہ معنی جو لفظ سن کر فوراً ذہن میں آئے، اگرچہ اس میں دوسرا معنی پائے جانے کا بھی کمزور احتمال ہو، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿مَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ﴾ (پس جو مجبور ہو جائے، نہ تو ظلم کرتے اور نہ ہی حد سے بڑھے تو اس پر کوئی گناہ نہیں) (البقرة: 173) اس میں باغی کا لفظ اگرچہ ظالم اور جاہل کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن ظالم کے لیے اس کا استعمال زیادہ ہے.

مؤول: جس میں کسی لفظ کو کسی دلیل کی بنیاد پر مرجوح معنی دیا گیا ہو، اور لفظ کا راجح معنی مراد نہ لیا گیا ہو، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ (اور ان (والدین) کے ساتھ مہربانی کرتے ہوئے اپنے بازو کو جھکائے رکھو) (الاسراء: 24)، اس میں جناح الذل: کا معنی والدین کے ساتھ تواضع اور حسنِ معاملہ کیا گیا ہے، اور جناح کو یہاں پَر کا معنی دینا ممکن نہیں، کیونکہ انسان کے پَر نہیں ہوتے.

مفہوم: وہ معنی جس پر لفظ کے نطق کی دلالت نہ ہو، اس کی دو قسمیں ہیں:

1- **مفهوم المُوَافقَة:** جس کا حکم منطوق کے حکم کے مطابق ہو، جیسا کہ ﴿فَلَا تَقُل لَّهُمَآ أُفٍّ﴾ (پس ان دونوں (والدین) کو اُفّ تک نہ کہو) (الاسراء 23) آیت کا منطوق یہ ہے کہ والدین کو اُفّ نہ کہو، جس کا مفہوم یہ ہے کہ انہیں گالی گلوچ کرنا اُف کہنے سے بھی زیادہ شدید ہے. اور جیسا کہ ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا﴾ (بیشک جو یتیموں کا مال ظلم کرتے ہوئے کھاتے ہیں) (النساء: 10) چنانچہ یتیم کے مال کو جلانے کا وہی حکم ہے جو اس کے مال کو ناحق طور پر کھانے کا ہے.

2- **مفهوم المُخَالَفَة:** جس کا مفہوم منطوق کے خلاف ہو، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کی جائے، اور نہ ہی کسی سے مدد لی جائے.

ترجمہ کا معنیٰ ومفہوم:

لغتِ عرب میں لفظ "ترجمہ" کلام کو ایک زبان سے دوسری زبان میں نقل کرنا ہے، جس کے دو طریقے ہیں:

(1) **لفظی ترجمہ**: جس میں صرف عبارت کے لحاظ سے دونوں زبانوں کے الفاظ کی نظم وترتیب کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اور ہر لفظ دوسری زبان کے لفظ کے برابر لکھا جاتا ہے.

(2) **تفسیری ترجمہ**: جس میں کلام کے مطلوب ومقصود کی دوسری زبان میں وضاحت کی جاتی ہے، جسے بامحاورہ ترجمہ بھی کہا جاتا ہے، اس میں عموماً دونوں زبانوں کے الفاظ کی نظم وترتیب کا لحاظ رکھے بغیر معانی ومفہوم کو مدّ نظر رکھا جاتا ہے. (التفسیر والمفسرون 1/23-24).

لفظی ترجمہ کا حکم:

بیشتر اہلِ علم کے ہاں قرآن کریم کا لفظی ترجمہ جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں ترجمہ کی شروط پائی جانا ممکن نہیں ہے، ان شروط میں سے:

1- ترجمہ کی جانے والی زبان کے کلمات کا ترجمہ شدہ زبان کے مقابلہ میں پایا جانا.
2- ترجمہ کی جانے والی زبان میں ترجمہ شدہ زبان کے برابر اور اس سے مشابہ معانی پائے جانا.
3- دونوں زبانوں میں کلمات کی ترتیب ایک جیسی ہونا.

بعض علماء کا کہنا ہے کہ صرف ایک جملہ یا آیت کے کچھ حصہ کا لفظی ترجمہ ممکن ہے، لیکن ایسا کرنا بھی حرام ہے، کیونکہ ایسا ترجمہ اپنے لفظ کا مکمل معنیٰ ادا نہیں کر سکتا، اور نہ ہی عربی فصیح زبان کی طرح دلوں پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس کی کوئی ایسی ضرورت بھی نہیں ہے، جبکہ تفسیری یا بامحاورہ ترجمہ اس غرض ومقصد کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے، لیکن کسی آیت یا جملہ کا مکمل ترجمہ کی بجائے صرف کلمات کا الگ الگ ترجمہ کرنا جائز ہے، تاکہ سیکھنے والے کو ان کلمات کے معانی کا علم ہو سکے.

تفسیری یا بامحاورہ ترجمہ اور اس کی شروط:

تفسیری یا بامحاورہ ترجمہ نہ کہ صرف جائز ہے، بلکہ ضروری ہے، کیونکہ غیر عرب لوگوں کے لیے قرآن کریم سمجھانے کا یہی ذریعہ ہے، اور جب کسی ذریعہ کے بغیر واجب ادا نہ ہو سکے تو وہ ذریعہ بھی واجب ہو جاتا ہے، لیکن بامحاورہ ترجمہ کی درج ذیل شروط ہیں:

1- اس ترجمہ کو قرآن کا بدل قرار نہ دیا جائے، کہ اصل قرآن کو چھوڑ کر صرف اسی ترجمہ پر اکتفا کر لیا جائے، چنانچہ لازماً ایک طرف قرآن کریم کی عربی عبارت ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ تفسیری ترجمہ لکھا جائے.
2- قرآن کے مطالب بیان کرنے کے لیے ایسی تفاسیر پر اعتماد کیا جائے جو احادیث وآثار، عربی لغت، اور شریعتِ اسلامیہ کے معتبر اصول وضوابط پر مبنی ہوں، یعنی جو التفسیر بالماثور کی شروط کے مطابق ہو.
3- مترجم کو عربی زبان اور جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے، دونوں زبانوں پر پوری طرح عبور حاصل ہو، دونوں زبانوں کے اسرار ورموز، طریقہ استعمال، مدلولات اور ان کے تقاضوں اور قواعد نحو وصرف کے اصولوں سے مکمل طور آگاہ ہو.
4- اسی طرح مترجم قرآن کے شرعی معانی، مفاہیم اور اصطلاحات کا صحیح علم رکھتا ہو.
5- مترجم کسی طرح کے گمراہ کن عقائد وافکار کا حامل نہ ہو، کیونکہ فاسد عقیدہ فکر وعمل پر چھا جاتا ہے، جس سے اس شخص کی تحریر وتقریر بھی متاثر ہوتی ہے.
6- مترجم ثقہ مسلمان ہو، لہٰذا کسی کافر، فاسق وفاجر یا بے دین شخص کا کیا ہوا ترجمہ قابل قبول نہیں ہے. (أصول في التفسير، للشيخ ابن عثيمين ص(41-42)